کافکا

کے افسانے

ترتیب و ترجمہ

نیر مسعود

کافکا کے افسانے

ترتیب و ترجمہ
نیر مسعود

فرانز کافکا

پہلی اشاعت: ۱۹۷۸ء

اترپردیش اُردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے

ناشر: نیّر مسعود، ادبستان، دین دیال روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

طباعت: الواعظ صفدر پریس، لکھنؤ

فروخت

شبستان
۲۱۸۔ شاہ گنج، الہ آباد

کتاب نگر
دین دیال روڈ. لکھنؤ

قیمت نو روپے

کافکا کے افسانے

"عقل را چه دیدم، دانشمندے مصروع کہ از
صرع برخاستہ دہشتناک بہ ہر سو می نگرد"

عرفی شیرازی

(عبدالرحیم خانخاناں کے نام خط جو عالم نزع میں لکھا گیا)

۳ جون ۱۹۲۴ء کو جب فرانز کافکا کی وفات ہوئی تو اسے کوئی بڑا ادبی سانحہ نہیں سمجھا گیا۔ اُس وقت تک وہ جرمن زبان کا ایک غیر معروف سا افسانہ نگار تھا جس کی تحریریں اپنے نہایت واضح بیانیہ انداز کے باوجود مفاہیم کے اعتبار سے ابہام کی حد تک مبہم تھیں اور ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی۔ اس نے کچھ غیر مطبوعہ تحریریں بھی چھوڑی تھیں لیکن اس وصیت

کے ساتھ کہ اُن کا ایک ایک حرف بغیر پڑھے جلا دیا جائے۔ اِس وصیت پر عمل نہیں کیا گیا اور نہ صرف یہ تحریریں بلکہ اُن کے وہ جملے اور الفاظ بھی چھاپ دیے گئے جن کو اُس نے قلم زد کر دیا تھا یا بدل دیا تھا۔

بیس سال کے اندر اندر ان تحریروں میں چھپے ہوئے آسیب نگاہوں کے سامنے آنے لگے۔ ہٹلر کے نازی جرمنی کو یہ آسیب اپنی بنیادیں ہلاتے محسوس ہوئے اور ان تحریروں کی اشاعت ممنوع قرار دے دی گئی مگر اس وقت بھی یہ سمجھنا مشکل تھا کہ کافکا کا شمار جدید ادب پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی شخصیتوں میں ہو جائے گا، یہاں تک کہ اشتراکی دنیا بھی ایک مدت تک اس کو نظر انداز کرنے کے بعد اُسے غور سے پڑھنا شروع کر دے گی۔

اِس وقت کافکا کو دستایفسکی کی طرح ادبیات میں پیچیدہ ترین دماغ کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تحریروں کی مذہبی، روحانی، صوفیانہ، فلسفیانہ، مابعد الطبیعاتی، سماجی، اخلاقی، نفسیاتی، جنسی تاویلیں کی جا رہی ہیں اور اس کی تحریروں میں ہر تاویل کا جواز موجود ہے۔ خود کافکا اِن تحریروں کو اپنی خواب نما باطنی زندگی کی عکاسی قرار دیتا ہے اور تاویلیں اب تک اِس باطنی زندگی کو پوری طرح گرفت میں نہیں لا سکی ہیں۔ اتنا البتہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کافکا کی یہ باطنی زندگی اس کی ظاہری زندگی سے بہت مختلف تھی۔

فرانز کافکا[1] ۳، جولائی ۱۸۸۳ء کو پراگ (چیکوسلوویکیا) میں پیدا ہوا۔ اُس

---

[1] کافکا کے حالاتِ زندگی میکس براڈ کی لکھی ہوئی سوانح عمری سے لیے گئے ہیں۔

نے پراگ کے جرمن اسکولوں میں تعلیم پائی اور بعد میں اپنے طور پر چیک زبان وادب کا بھی غائر مطالعہ کیا۔ وہ بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا اور اس کے بعد والی بہن اُس سے چھ برس چھوٹی تھی۔ عمر کے اسی فرق کی وجہ سے اس کا بچپن تنہائی کی کیفیت میں گزرا اور اسے کھیل کود میں کوئی خاص دلچسپی پیدا نہ ہو سکی۔ البتہ اپنے ماں باپ کی سالگرہ کے موقعوں پر وہ چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھتا تھا جو گھر میں کھیلے جاتے تھے، لیکن کافکا خود ان ڈراموں میں کام نہیں کرتا تھا۔ وہ خود کو بدصورت سمجھتا، اسی وجہ سے اس کو عمدہ نئے کپڑوں کی خواہش نہیں ہوتی تھی اور وہ پرانے خراب سلے ہوئے کپڑے پہن کر دبا سکڑا ہوا چلتا تھا۔

کافکا کا باپ ہرمان کافکا ایک لحیم شحیم آدمی تھا جو زندگی میں بڑی جدوجہد اور جفاکشی کے بعد کامیاب ہوا تھا۔ کافکا اپنے باپ سے خائف تھا۔ وہ خود کو اس کے ساتھ ایک مستقل سرد جنگ میں مبتلا پاتا تھا۔ یہ ذہنی جنگ تھی۔ کافکا اپنے باپ سے کہیں زیادہ ذہین تھا لیکن اس کے باوجود اور اغلباً اسی وجہ سے، وہ اپنے باپ کو اپنی ذہنی اذیت کا احساس نہیں کرا پاتا تھا۔ اس کو اپنا باپ بے رحم، سرد مہر اور بے حس معلوم ہوتا تھا، اگرچہ حقیقت شاید یہ نہ تھی۔ شاذ و نادر ایسے موقعے بھی آتے تھے (مثلاً کافکا کی بیماری) جب اسے اپنا باپ مہربان انسان معلوم ہوتا اور ان موقعوں پر کافکا خوشی سے رونے لگتا تھا۔ باپ کے سلسلے میں کافکا کی ذہنی کشمکش کی بہترین روداد وہ طویل خط ہے جو اس نے نومبر ۱۹۱۹ء میں لکھا تھا اور اُسے باپ تک پہنچانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی مشہور ترین طویل کہانی "قلبِ ماہیت" اور ایک اور کہانی "فیصلہ" میں بھی باپ کے ساتھ اس کے تعلقات کی نہایت عمدہ آئینہ داری ہوئی ہے۔ خوش گفتار کافکا باپ سے گفتگو کرتے وقت

اٹکنے اور ہکلانے لگتا تھا: آپ کے سامنے میری خود اعتمادی رخصت ہو جاتی ہے اور ایک طرح کا احساسِ جرم اس کی جگہ لے لیتا ہے" ہاس نفسیاتی کشمکش سے کافکا کبھی چھٹکارا نہ پا سکا لیکن جوانی میں اُس کی ظاہری شخصیت سے اس کشمکش کا سُراغ نہیں ملتا تھا۔

دیکھنے میں وہ ایک تندرست نوجوان تھا جس کی صحبت بہت خوش گوار ہوتی تھی۔ دوستوں میں وہ جی کھول کر ہنستا ہنساتا اور شگفتہ اور پُر مغز گفتگو کرتا تھا۔ سماجی زندگی میں وہ ایک روشن فکر اور بڑے سلجھے ہوئے دل و دماغ کا انسان تھا جس کے ذہن میں ہر خیال نہایت واضح ہوتا تھا۔ اور اتنی ہی وضاحت کے ساتھ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ اگر کوئی دوست کسی مشکل میں پڑجاتا تو کافکا اس کو مناسب ترین مشورے دیتا تھا جو مصلحت اور عقلِ دنیا سے مملو ہوتے اور عموماً مشکل کو حل کر دیتے تھے۔ لیکن اپنے نجی معاملات میں وہ بے دست و پا اور ششش و پنج میں مبتلا نظر آتا تھا۔ وہ خود کو کمالِ انسانی کے بلند ترین معیاروں پر جانچتا تھا جس کی وجہ سے اس میں ایک موہ لینے والی حیا اور کم آمیزی پیدا ہو گئی تھی جو مافوق الفطرت سی لگتی تھی اور کبھی کبھی اس کی شخصیت کے گرد تقدس کا ہالہ بنا دیتی تھی۔

شروع شروع میں کافکا نے اپنی ادبی سرگرمیوں کو صیغۂ راز میں رکھا۔ وہ اپنی ابتدائی تحریریں ضائع کر دیتا تھا۔ اس کا قریب ترین دوست میکس براڈ بھی ایک عرصے تک اس بات سے بے خبر رہا کہ کافکا لکھتا بھی ہے۔ جب کافکا نے ایک اخبار کے تحریری مقابلے میں اپنا افسانہ بھیجا اس وقت براڈ کو اس کے اس شغلے کا علم ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں برلن کے ایک ہفت روزہ رسالے میں براڈ نے قابلِ ذکر مصنفوں کی فہرست میں کافکا کا

نام بھی شائع کر دیا۔ اُس وقت تک کافکا کی کوئی تحریر منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔ اس پر کافکا نے اس کا خاصا مضحکہ اڑایا[1]۔

پراگ کی یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کافکا نے دستور کے مطابق ایک سال تک عدالت میں بلا اُجرت پریکٹس کی۔ ۱۹۰۸ء میں بڑی دوا دوش کے بعد اس کو پراگ کی ایک بیمہ کمپنی میں کلرکی مل گئی۔ وہ کمپنی کے انسدادِ حادثات والے شعبے میں تھا اور اسے حادثوں کا شکار ہونے والوں کے معاملات دیکھنا ہوتے تھے۔ کمپنی کی سالانہ رپورٹ کے لیے کافکا نے ایک خالص دفتری نوعیت کا مضمون لکھا تھا لیکن اس مضمون میں بھی اس کے منفرد ذہن کی رَو دوڑی ہوئی ہے۔ وہ پوری توجہ اور دلچسپی سے اپنے منصبی فرائض انجام دیتا تھا اور بظاہر اس دفتری زندگی سے بالکل مطمئن تھا۔ لیکن اس کی ڈائریوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذہنی اذیت میں مبتلا تھا اور اُسے اس بات کی شدید کوفت تھی کہ دفتری معروفیت اس کی ادبی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دے رہی ہے ("... میرے ذہن میں کیسی زبردست دنیا آباد ہے! مگر اسے کیوں کر باہر لاؤں؟")۔ ان ڈائریوں میں مختلف تحریروں کے خاکے، پلاٹ اور ناولوں یا افسانوں کی شروعات لکھی ہوئی ہے۔ ان میں سے بہت کم تحریریں مکمل ہو سکیں۔ کافکا کا خیال تھا کہ فرصت اور یکسوئی میسر ہو تو وہ کئی دن تک شبانہ روز مسلسل لکھ سکتا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ اس کے اندر تخلیقی صلاحیتیں جوش مار رہی ہیں اور ان کو بروئے کار لانے سے خود اس کی الجھنیں حل ہو سکتی ہیں، لیکن اسے لکھنے کا زیادہ موقع نصیب نہیں ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خودکشی کے بارے میں سوچنے لگا۔

---

[1] کافکا کی موت کے بعد براڈ ہی نے اس کی غیر مطبوعہ اور دستیاب تحریریں تلاش کر کر کے شائع کیں۔

۱۹۰۹ء سے کافکا کی تحریروں کی اشاعت شروع ہوئی، لیکن ان کی طرف کوئی خاص اعتنا نہیں کی گئی۔ اور بظاہر خود کافکا کو اپنی ادبی شہرت اور کامیابی یا اپنی تحریروں کے چھپنے میں کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں تھی۔

اگست ۱۹۱۲ء میں کافکا کی ملاقات ایک لڑکی ف سے ہوئی (جس کے نام اس کی کہانی "فیصلہ" معنون ہے) اور اس کے دل میں شادی کے خیالات نے شدت پکڑی۔ دو سال تک دونوں کے تعلقات میں مدّوجزر آتے رہے اور کافکا ف کے ساتھ شادی کرنے یا نہ کرنے کے تذبذب سے اذیت میں مبتلا رہا۔ ۱۹۱۲ء کے اوسط میں ف کے ساتھ اس کی منگنی ہوئی اور تین مہینے کے اندر ٹوٹ گئی۔ اس کے دو مہینے کے بعد کافکا نے اپنا ناول "مقدمہ" لکھنا شروع کیا (جسے چھپوانا اُس نے پسند نہیں کیا تھا اور اُسے جلا دینے کی وصیت کی تھی)۔ ف کے ساتھ اس کی خط کتابت بھی جاری تھی اور وہ اُس کے ساتھ شادی نہ کرنے کے فیصلے سے مطمئن نہیں تھا۔ پانچ سال تک وہ اسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ اسی اثنا میں اُس نے اپنے گھریلو ماحول سے پیچھا چھڑانے کی بھی کوشش کی اور الگ ایک کمرے میں رہنے لگا۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، اُس نے فوج میں بھرتی ہونا چاہا لیکن خرابی صحت کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس دوران اُس کی تخلیقی صلاحیتیں عروج پر تھیں اور حلقۂ احباب میں اس کی صحبت بہت خوشگوار تھی۔ ایک بار پھر اس نے ف سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کی تیاریاں بھی شروع کر دیں، لیکن اس پر بیماری کا حملہ ہوا اور وہ خون تھوکنے لگا۔ بالآخر اس نے ف سے شادی نہ کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا، ف کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور اپنے ہمراز دوست میکس براڈ کے پاس آ کر زندگی میں پہلی اور آخری بار پھوٹ پھوٹ کے رویا۔ اس کے ڈیڑھ سال بعد ف کی شادی ہو گئی۔

۱۹۱۵ء میں کافکا نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا "یہاں کوئی نہیں جو مجھ کو پوری طرح سمجھتا ہو۔ اگر ایسا کوئی مل جائے تو گویا مجھے خدا مل جائے"۔ زندگی کے آخری دور میں ڈورا کی دوستی نے کافکا کی یہ مراد شاید پوری کردی۔ ۱۹۲۳ء میں ڈورا سے اس کی دوستی کا آغاز ہوا۔ اس وقت وہ چالیس سال کا اور ڈورا انیس بیس سال کی لڑکی تھی۔ کافکا نے طے کر لیا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر برلن میں ڈورا کے ساتھ زندگی گزارے گا۔ چنانچہ جولائی میں وہ اپنے گھر والوں کی مخالفت کو نظر انداز کر کے برلن چلا گیا اور پہلی بار اس نے اعتراف کیا کہ وہ خوش ہے۔ اس کی صحت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی۔ مگر وہ خوش تھا۔ یہیں اس کی یہ دیرینہ تمنا بھی پوری ہو گئی کہ والدین کے سائے میں پلنے والے بیٹے کے بجائے خود مختار انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔ اس کا تخلیقی کام بھی جاری تھا، لیکن اسی زمانے میں جرمنی میں اشیاء کی قلت اور گرانی کا دور شروع ہو گیا۔ سردی ہولناک تھی اور کوئلہ نایاب۔ کرسمس (۱۹۲۳ء) اور سالِ نو (۱۹۲۴ء) کے درمیان کافکا پر تپ کے کئی حملے ہوئے۔ گرانی نے اس کو پریشان کرنا شروع کیا اور اب اسے زندگی کی گاڑی کا آگے بڑھانا دشوار معلوم ہونے لگا۔ وہ کبھی کبھی اپنے دوستوں سے ان پریشانیوں کا ذکر بھی کرتا مگر مزاح کے پیرایے میں۔

آخر کار کافکا کی بیماری نے واضح طور پر تشویشناک صورت اختیار کرلی ۔۔۔ ۱۷ مارچ ۱۹۲۴ء کو میکس براڈ اسے پراگ لے آیا۔ کچھ دن بعد ڈورا بھی پراگ آ گئی۔ کافکا اب پھر اپنے والدین کے ساتھ رہ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ آزاد زندگی کے لیے جدوجہد میں وہ ناکام ہو چکا ہے۔ گھر والوں کی پوری توجہ اور خدمت کے باوجود اس کی حالت بگڑتی گئی۔ وہ دق کا مریض تھا۔ اسے ایک سینیٹوریم میں داخل کیا گیا۔ وہاں

سے ویانا کے ایک اسپتال میں منتقل کیا گیا اور اپریل کے آخر میں ایک اور سینیٹوریم میں بھرتی کیا گیا لیکن کہیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اب یہ بات یقینی ہوگئی اور کافکا خود بھی سمجھ گیا کہ وہ مر رہا ہے۔ اس پر رہ رہ کر درد کے دورے پڑتے تھے۔ کچھ نگلنے اور کھانسنے سے یہ درد اور بھی شدید ہو جاتا، اور اب محض مارفیا وغیرہ کے انجکشن دے کر تکلیف کا احساس کم کرانا ہی اس کا علاج رہ گیا تھا۔

۲ جون ۱۹۲۴ء کی شام کو وہ اچھا بھلا اور خوش وخرم نظر آ رہا تھا۔ اس دن اس نے اپنی ماں اور باپ کے نام ایک خط لکھا اور اپنی ایک زیر طبع کتاب کے پروف دیکھے۔ نصف شب کے قریب وہ سو گیا لیکن صبح ہوتے اس کا تنفس بگڑ گیا۔ نزع کی شدت میں وہ ڈاکٹر پر خفا ہونے لگا۔ وہ کوئی ایسی دوا چاہتا تھا جو اس کی تکلیف کا خاتمہ کر دے۔ وہ زہر چاہ رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا:

"مجھے مار ڈالو نہیں تو میرا خون تمھاری گردن پر ہوگا۔"

اس کا دوست ڈاکٹر کلاپسٹاک اس کے پاس سے اٹھنے لگا، کافکا نے اسے روکا۔ ڈاکٹر نے کہا "میں تمھیں چھوڑ کر جا نہیں رہا ہوں۔" کافکا بولا:

"مگر میں تمھیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

اسی دن، سہ شنبہ ۳ جون ۱۹۲۴ء کو اکتالیس سال کی عمر میں فرانز کافکا مر گیا۔

کافکا کی طویل کہانی "قلب ماہیت" کا ہیرو ایک صبح سو کر اٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ انسان سے ایک بہت بڑے مکوڑے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کے ناول "مقدمہ" کے ہیرو کو ایک دن اچانک بتایا جاتا ہے کہ اس کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس پر مقدمہ چلایا

جائے گا، مگر اسے یہ نہیں بتایا جاتا کہ اس کا جرم کیا ہے۔ مقدمہ کس قانون کے تحت دائر ہوا ہے۔ اس کی سماعت کب اور کہاں ہوگی، اور وہ ان سب باتوں سے بے خبر اپنی صفائی کی کوشش میں لگا رہتا ہے، آزاد گھومتا ہے لیکن جانتا ہے کہ وہ زیر حراست ہے۔ بالآخر اس کو موت کی سزا ہو جاتی ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ یہ سزا کب اور کس عدالت میں کس نے سنائی، بلکہ اُسے کوئی یہ بھی نہیں بتاتا کہ اس کو موت کی سزا سنائی گئی ہے، پھر جب دو مسخرے قسم کے جلّاد اس کے پاس آتے ہیں تو وہ چپ چاپ اُن کے ساتھ ہو لیتا ہے اور جلّاد اس کو لے جا کر ذبح کر دیتے ہیں۔ کافکا کے ایک اور ناول "قلعہ" کے ہیرو کو ایک قلعے میں ملازمت مل جاتی ہے لیکن جب وہ کام پر پہنچتا ہے تو اس کو قلعے میں داخلہ نہیں ملتا، اسے یہ بھی نہیں معلوم ہو پاتا کہ اس کو ملازم رکھنے والے کون ہیں۔ ملازمت کے شرائط کیا ہیں، اور اس کے ذمّے کون سے کام ہیں، لیکن وہ اپنے فرائض انجام دیتا رہتا ہے اور مرتے دم تک اُسے ان سوالوں کے جواب نہیں ملتے۔

ظاہر ہے یہ سب تمثیلی کہانیوں کے پلاٹ ہیں، لیکن فرانز کافکا کا فن یہ ہے کہ اس کی تحریر کو پڑھتے وقت اُس پر تمثیل کا گمان نہیں گزرتا اور اُس کا قاری انہونی سے انہونی بات کو ایک حقیقت کی طرح قبول کر لیتا ہے۔ "قلب ماہیت" کے ہیرو کا مکوڑا بن جانا خود ہیرو اور اس کے ماں باپ کے ساتھ قاری کو بھی ذہنی دھچکا پہنچاتا ہے لیکن اس کے بعد وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے، اور پھر اس حقیقت کی اہمیت بھی اتنی نہیں رہ جاتی جتنی اس بات کی کہ مکوڑا بن جانے کے بعد اس کے مسائل کیا ہیں۔ مقدمہ میں مقدمے کی ہر بات کا نامعلوم ہونا قاری کو کچھ دیر کے لیے متحیر کرتا ہے لیکن آخر ہیرو کے ساتھ اس کے ذہن میں بھی مقدمے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے اور زیادہ اہمیت اس کی ہو جاتی

ہے کہ اس مقدمے میں کامیابی کیونکر ممکن ہے۔ اور ہیرو کا سزائے موت پانا بھی کسی انجانے قانون کی رو سے عین انصاف معلوم ہوتا ہے اور جب ذبح ہو کر دم توڑتے وقت ہیرو کہتا ہے "ایک کتے کی طرح!" تو قاری کا ذہن بھی اس کی ہم نوائی کرتا ہے۔ اسی طرح "قلعہ" میں ملازمت کی بے سروپائی کا احساس بہت جلد ختم ہو جاتا ہے اور اصل سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس صورت میں ملازم اپنے فرائض کیونکر انجام دے اور مخالف عناصر سے کس طرح نبٹے۔

یہی نہیں، انسان کا مکوڑا بن جانا، ایک انجانے قانون کے تحت کسی پر مقدمہ چلنا اور سزائے موت، ایک بے سروپا ملازمت، کافکا کے یہاں یہ سب باتیں مہمل لگنے کے بجائے کسی نہایت پُراسرار منطق پر مبنی اور بالکل قرین قیاس معلوم ہوتی ہیں جن کی بنیاد پر اٹھنے والے مسائل قاری کو کبھی دہشت زدہ کر دیتے ہیں، کبھی مایوس اور کبھی اس کے جذبات کو کچل کر رکھ دیتے ہیں۔

داستایفسکی کی تحریروں کے برخلاف، جنھیں پڑھ کر انسان اپنے آپ کو بدلا ہوا محسوس کرتا ہے، کافکا کی تحریر پڑھ کر اسے دنیا بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ شروع شروع میں کافکا کی تحریر خواب پریشاں کا تاثر دیتی ہے لیکن آخر آخر یہ خواب حقیقت بن جاتا ہے اور مطالعہ ختم کر لینے کے بعد جب قاری اپنی مانوس دنیا میں واپس آتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک نئے خواب پریشاں میں داخل ہو گیا ہے۔ لیکن اس خواب پریشاں میں انتشار نہیں ہے بلکہ کسی مرموز نظام کے تحت اس میں سب کچھ ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ ربط کا یہ احساس قاری کے دماغ میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ہر چیز میں ایک نہایت مبہم مگر نہایت اہم قسم کی معنویت نظر آنے لگتی ہے۔ یہ معنویت مذہبی سے لے کر جنسی تک

ہوگئی ہے۔ کافکا کی تحریروں کی کثیر التعداد تاویلوں کا یہی سبب ہے اور یہی کافکا
کی انفرادیت ہے۔

نئے اردو افسانے پر بھی براہ راست یا بالواسطہ کافکا کا اثر پڑا ہے، لیکن عموماً یہ اثر
خوشگوار سے زیادہ ناگوار صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ کافکا کی تحریروں کا اصل مفہوم، مقصد
پیغام، جو بھی کہہ لیجیے، کتنا ہی مشکل، مبہم، پیچیدہ کیوں نہ ہو، اس کا بیانیہ نہایت
واضح و روشن، مربوط اور جزئیات کے انتخاب میں اس کی حیرت خیز چابکدستی کا ثبوت
ہے۔ اُسے پڑھ کر فلابیر کی یاد آتی ہے (جس سے کافکا بہت متاثر تھا۔ کافکا ہی نہیں،
داستایفسکی بھی) اُسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس روشن بیانیے کے پیچھے نہایت
دقیق، دور رس اور پیچ در پیچ معانی کی ایک نیم تاریک دنیا آباد ہے۔ نئے اردو افسانہ
نگاروں میں سے بیشتر نے یہ کیا کہ پیچ در پیچ معانی پیدا کرنے کی فکر میں اپنے بیانیے ہی
کو مبہم، نیم تاریک اور پیچ در پیچ کر دیا جسے پڑھ کر اندیشہ ہوتا ہے کہ اس پیچاک کے
پیچھے جو مفاہیم ہیں وہ کہیں بہت سرسری اور پیش پا افتادہ نہ ہوں۔ کافکا بہت سلجھے
ہوئے اسلوب میں بات کہتا ہے اور اس کا قاری از خود اس کے مفاہیم کو الجھانے اور
پیچ دینے پر مجبور ہوتا ہے، یہ افسانہ نگار الجھے ہوئے جملوں میں بات کہتے ہیں اور اُن
کے قاری پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس الجھی ہوئی بات کو سلجھا کر اصل مفہوم تلاش
کرے۔ اور اسی تلاش کے سوال پر قاری اور افسانہ نگار دونوں ایک دوسرے سے
بدگمان اور آزردہ ہو جاتے ہیں۔ البتہ جن نئے افسانہ نگاروں نے کافکا کی طرح اپنے بیانیے

کو روشن رکھا ہے اور اُن کے یہاں ایک ایسی معنویت کا احساس ہوتا ہے جس تک قاری
ہمدردی کے ساتھ پہنچنا چاہے، انھیں کافکا سے صحیح طور پر متاثر کہا جا سکتا ہے۔

اس مجموعے میں کافکا کی چھوٹی بڑی بیس تحریریں شامل ہیں۔ میں نے ۱۹۷۱ء میں
کافکا کی پانچ مختصر تحریروں کا ترجمہ ماہنامہ "شب خون" میں شائع کیا تھا۔ عزیز دوست
شمس الرحمٰن فاروقی نے فرمائش کی کہ میں اس کی کچھ اور تحریروں کو ترجمہ کرکے اسے کتابی
صورت دے دوں۔ انھوں نے ترجمے کی متعدد مشکلیں بھی حل کیں۔ فروری ۱۹۷۴ء تک
یہ سب ترجمے مکمّل ہو گئے، مگر طباعت کے ہفت خواں طے کرنے کی ہمّت نہ تھی اس لیے
میں نے مسوّدے کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔ ۷۴ء کے آخر میں ڈاکٹر مسیح الزّماں کی نظر اس
مسوّدے پر پڑی اور وہ اسے اپنے ساتھ الٰہ آباد لے گئے۔ دس دن کے اندر اس کی کتابت
شدہ کاپیاں انھوں نے مجھ کو بھیج دیں اور لکھا کہ اس کا مقدمہ اور تصحیح شدہ کاپیاں
بھیج دو، کتاب ایک ہفتے کے اندر تیار ہو جائے گی۔ میں نے مقدمے کا مسودہ تیار
کر لیا لیکن اس کو آخری شکل میں صاف نہیں کرنے پایا تھا کہ فروری ۷۵ء میں ڈاکٹر
مسیح الزّماں کی اچانک وفات ہو گئی اور میں اس مجموعے سے برگشتہ خاطر ہو گیا۔

اب خدا خدا کر کے اس کی اشاعت کی نوبت آ رہی ہے۔ قمر احسن، انیس اشفاق،
محمد مسعود، شہنشاہ مرزا، شاہ نواز اور دوسرے نوجوان ادیب دوستوں کو اس کی اشاعت
میں دلچسپی تھی اور یہ مجموعہ انھیں نوجوان دوستوں اور اُن کے ہم قلم ساتھیوں کی نذر ہے۔

نیّر مسعود

شکاری گریکس

بندرگاہ کی دیوار پر دو لڑکے بیٹھے ہوئے پانسے سے کھیل رہے تھے۔ تاریخی یادگار کی سیڑھیوں پہ بیٹھا ایک شخص اخبار پڑھ رہا تھا اور اس سورما کے سایے میں سستا رہا تھا جو تلوار علم کیے ہوئے تھا۔ ایک لڑکی چشمے سے بالٹی بھر رہی تھی۔ ایک پھل والا اپنی ترازو کے پاس لیٹا سمندر کو گھور رہا تھا۔ ایک کیفے کی کھلی ہوئی کھڑکی اور دروازے میں سے دو آدمی کیفے کے اُس سرے پر شراب پیتے دیکھے جا سکتے تھے۔ کیفے کا مالک سامنے ہی میز کے پیچھے بیٹھا تھا اور اونگھ رہا تھا۔ ایک بادبانی جہاز چھوٹی سی بندرگاہ کی طرف ایسی خاموشی کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا تھا جیسے کوئی غیرمرئی شے اُسے پانی کے اوپر اوپر چلا رہی ہو۔ نیلی وردی پہنے ہوئے ایک شخص جہاز سے اُتر کر کنارے پر آیا اور ایک حلقے میں سے جہاز کی رسی گزار کر کھینچنے لگا۔ اس جہاز والے کے پیچھے پیچھے دو اور آدمی سنہرے بٹنوں والے سیاہ کوٹ پہنے ہوئے ایک ارتھی لیے ہوئے چل رہے تھے۔ جس پر پڑے ہوئے ریشمی چھینٹ کے جھالردار کپڑے کے نیچے کوئی آدمی لیٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

گھاٹ پر کسی نے بھی ان نوواردوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔

حتیٰ کہ جب انھوں نے جہاز والے کے انتظار میں جو ابھی تک رسّی سے الجھا ہوا تھا، ارتھی زمین پر رکھ دی تب بھی کوئی ان کی طرف نہیں بڑھا۔ کسی نے اُن سے کوئی سوال نہیں کیا، کسی نے ایک بار بھی ان کی طرف استفہامی نظروں سے نہیں دیکھا۔

جہاز والے کو ایک عورت کی وجہ سے مزید رُکنا پڑا جو ایک بچے کو چھاتی سے لگائے، بال کھولے ہوئے اب عرشے پر نظر آرہی تھی۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اُس نے ایک زردی مائل رنگ کے دو منزلہ مکان کی طرف اشارہ کیا جو سمندر کے کنارے بائیں طرف ڈھلوان پر بنا ہوا تھا۔ ارتھی والوں نے اپنا بار اُٹھایا اور اس کو نیچے نیچے مگر شان دار کھمبوں والے دروازے پر لے گئے۔ ایک چھوٹے سے لڑکے نے عین اس موقعے پر ایک کھڑکی کھول کر اس جماعت کو مکان کے اندر غائب ہوتے دیکھا، پھر جلدی سے کھڑکی بند کردی۔ اب دروازہ بھی بند تھا۔ یہ سیاہ شاہ بلوط کا بہت مضبوط بنا ہوا دروازہ تھا۔ فاختاؤں کی ایک ٹکڑی جو گرجا گھر کے گھنٹے کے گرد چکر لگارہی تھی مکان کے سامنے سڑک پر اُتر آئی۔ فاختائیں دروازے کے آگے اس طرح اکٹھا ہوگئیں جیسے اُن کا راتب مکان کے اندر ہو۔ اُن میں سے ایک اُڑ کر مکان کی پہلی منزل پر پہنچی اور کھڑکی کے ایک شیشے پر ٹھونگیں مارنے لگی۔ یہ شوخ رنگ کے اچھی طرح پالے پوسے ہوئے خوب صورت پرندے تھے۔ جہاز والی عورت نے ہاتھ بھر کر ان کو دانہ ڈالا۔ اُنھوں نے دانہ چُگ لیا اور اُڑ کر عورت کے پاس چلی گئیں۔

اب ایک آدمی اونچا ہیٹ لگائے ہوئے جس میں کریپ کا فیتہ ٹکا ہوا تھا، بندرگاہ کو آنے والی تنگ اور بہت ڈھلوان گلیوں میں سے ایک گلی اُتر کر نیچے آیا۔ اس نے بڑی چوکسی کے ساتھ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کو ہر چیز ناگوار گزری ہے۔ ایک گوشے میں کچھ انگور دیکھ کر اس کا منھ بگڑ گیا۔ یادگار کی سیڑھیوں پر پھلوں کے چھلکے پڑے تھے۔ اس نے رواروی میں اپنی چھڑی سے ان کو سرکا دیا۔ اس نے مکان کا دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا اور ساتھ ہی ساتھ سیاہ دستانہ چڑھے ہاتھ سے اپنا ہیٹ اتار دیا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا اور ڈیوڑھی میں کوئی پچاس چھوٹے چھوٹے لڑکے دو قطاریں بنائے ہوئے نمودار ہوئے اور اس کو جھک کر آداب بجالائے۔

جہاز والا زینے سے اتر کر آیا، اس نے اس سیاہ پوش شخص کو سلام کیا، اُسے پہلی منزل پر لے گیا۔ بچوں کی بھیڑ اُن سے تھوڑا سا فاصلہ رکھے پیچھے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ صحن کے چاروں طرف بنے ہوئے روشن اور پُرشکوہ برآمدے میں سے ہوتے ہوئے وہ دونوں عقبی رُخ ایک سرد کشادہ کمرے میں داخل ہوئے جس کی کھڑکی میں سے پتھر کی ایک سیاہی مائل ننگی دیوار کے سوا کوئی عمارت نظر نہیں آتی تھی۔ ارتھی والوں سے ارتھی کے سرہانے بہت کی لمبی لمبی شمعیں لگوا کر روشن کرائی جا رہی تھیں۔ لیکن ان شمعوں نے روشنی نہیں پھیلائی بلکہ اُن پرچھائیوں کو جو ابھی تک غیر متحرک تھیں اس طرح ڈرا دیا کہ وہ دیواروں پر بھاگ کر لرزنے لگیں۔ ارتھی کو جو کپڑا ڈھانکے ہوئے تھا

وہ ہٹا دیا گیا تھا۔ ارتھی پر ایک آدمی لیٹا تھا جس کے بال بے طرح الجھے ہوئے تھے اور وہ کچھ شکاری سا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور بظاہر اُس کی سانس بھی نہیں چل رہی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں، تاہم یہ اندازہ فقط اُس کی ارتھی اور پوشش وغیرہ ہی سے ہوتا تھا کہ غالباً یہ آدمی مر چکا ہے۔

سیاہ پوش شخص بڑھ کر ارتھی کے پاس آ گیا۔ اُس نے اس پر پڑے ہوئے آدمی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، پھر دو زانو بیٹھ کر دعا کرنے لگا۔ جہاز والے نے ارتھی والوں کو کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل گئے۔ انھوں نے لڑکوں کو جو باہر بھیڑ لگائے ہوئے تھے بھگا دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ مگر اس سے بھی سیاہ پوش شخص مطمئن نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے جہاز والے کی طرف دیکھا۔ جہاز والا سمجھ گیا اور پہلو کے ایک دروازے سے ہو کر دوسرے کمرے میں غائب ہو گیا۔ اچانک ارتھی پر پڑے ہوئے آدمی نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنا چہرہ سیاہ پوش شخص کی طرف گھمایا اور پوچھا:

"تم کون ہو؟"

ذرا بھی تعجب کا اظہار کیے بغیر سیاہ پوش شخص بیٹھے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا:

"ریوا کا برگو ماسٹر[1]!"

---

[1] برگو ماسٹر: جرمنی اور چکوسلواکیہ کے شہروں کا صدر بلدیہ۔

ارتھی پر کے آدمی نے سر کو جنبش دی، بازو کی ہلکی سی حرکت سے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور برگو ماسٹر کے بیٹھ جانے کے بعد بولا:

"یہ تو مجھے معلوم ہی تھا، برگو ماسٹر، لیکن ہوش میں آنے کے فوراً بعد چند لمحوں تک مجھے کبھی کچھ نہیں یاد آپاتا۔ ہر چیز میری آنکھوں کے سامنے چکرانے لگتی ہے اور بہتر یہی ہوتا ہے کہ جو کچھ مجھ کو معلوم ہو اس کے بارے میں بھی دریافت کر لوں۔ تم بھی شاید جانتے ہو کہ میں شکاری گریکس ہوں!"

"یقیناً" برگو ماسٹر نے کہا، "تمہارے آنے کی اطلاع مجھے رات کو دے دی گئی تھی۔ ہم دیر کے سوئے ہوئے تھے کہ آدھی رات کے قریب میری بیوی چلائی، 'سالواتور!'— یہ میرا نام ہے — 'وہ دیکھو کھڑکی پر فاختہ!' سچ مچ وہ فاختہ ہی تھی لیکن اتنی بڑی جیسے مرغ۔ وہ اڑ کر میرے پاس آگئی اور میرے کان میں بولی، 'مرا ہوا شکاری گریکس کل آرہا ہے، شہر کے نام پر اس کا استقبال کرو۔'"

شکاری نے سر ہلا دیا اور زبان کی نوک اپنے ہونٹوں پر پھیری:

"ہاں۔ فاختائیں مجھ سے پہلے ہی اڑ کر یہاں چلی آئیں۔ لیکن برگو ماسٹر! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ریوا ہی میں رہوں گا؟"

"یہ تو میں ابھی نہیں کہہ سکتا۔" برگو ماسٹر نے جواب دیا۔ "کیا تم مرے ہوئے ہو؟"

"ہاں!" شکاری بولا۔ "جیسا کہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ برسوں ہوئے، ہاں یہ صدہا برس پہلے کی بات ہوگی۔ میں کالے جنگل میں — یعنی جرمنی میں — سانبھر کا شکار کھیلتے ہوئے ایک کگار پر سے نیچے گر پڑا تھا۔ تب سے میں

مرا ہوا ہوں۔

"لیکن تم زندہ بھی تو ہو۔" برگوماسٹر نے کہا۔

"ایک لحاظ سے۔" شکاری بولا "ایک لحاظ سے میں زندہ بھی ہوں۔ میرا موت کا جہاز راستہ بھٹک گیا۔ معلوم نہیں یہ چرخ کی غلط گردش تھی، یا ناخدا کی ایک لمحے کی غفلت، یا خود میری اپنے پیارے دیس کی طرف گھوم پڑنے کی خواہش، میں کہہ نہیں سکتا کیا بات تھی۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں دنیا ہی میں پڑا رہ گیا۔ اور اُس وقت سے اب تک میرا جہاز ارضی سمندروں کو کھنگال چکا ہے۔ تو میں جس کو اپنے کوہساروں کے درمیان رہنے سے بڑھ کر کچھ پسند نہیں تھا، مرنے کے بعد سے دنیا کی تمام سرزمینوں کا سفر کرتا پھرتا ہوں۔"

"اور دوسری دنیا سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں؟" برگوماسٹر نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

"میں ہمیشہ کے لیے اُس دنیا کو جانے والی زبردست سیڑھیوں پر ہوں۔" شکاری نے جواب دیا۔ "اُن بے تحاشا چوڑی اور کھلی ہوئی سیڑھیوں پر میں گرتا پڑتا چلتا رہتا ہوں۔ کبھی اوپر کی جانب، کبھی نیچے کی طرف، کبھی داہنے رُخ، کبھی بائیں سمت۔ مسلسل گردش میں ہوں۔ شکاری تتلی بن کر رہ گیا ہے مت ہنسو۔"

"میں ہنس نہیں رہا ہوں۔" برگوماسٹر نے صفائی پیش کی۔

"تمہاری بڑی مہربانی ہے۔" شکاری نے کہا۔ "میں مسلسل گردش میں ہوں لیکن جیسے ہی میں زینوں کا پورا سلسلہ چڑھ جاتا ہوں اور دروازہ مجھے اپنے سامنے چمچماتا ہوا نظر آنے لگتا ہے، ویسے ہی میں اپنے پرانے جہاز پر جاگ اُٹھتا ہوں جو اسی طرح بے بسی کے ساتھ کسی نہ کسی فانی سمندر میں پھنسا ہوتا ہے۔ میں اپنی کوٹھری میں

پڑا ہوتا ہوں اور میری مدتوں پرانی موت کی بنیادی غلطی مجھ پر ہنستی ہے۔ ناخدا کی بیوی جولیا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور جس ملک کے ساحل سے ہم اس وقت گزر رہے ہوتے ہیں اس کا صبح کا مشروب مجھے لا تھمیں لا دیتی ہے۔ میں لکڑی کے تختے پر پڑا رہتا ہوں۔ میں میلا کچیلا کفن لپیٹے رہتا ہوں۔ کوئی میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرے گا۔ میرے سر اور ڈاڑھی کے کھچڑی بال ایسے الجھ کر رہ گئے ہیں کہ سلجھائے نہیں جا سکتے۔ میرے بدن کو لمبی جھالر والی چھینٹ کی بڑی سی زنانی چادر ڈھانپے رہتی ہے۔ ایک مقدس شمع میرے سرہانے لگی ہوتی ہے اور مجھ پر روشنی ڈالتی رہتی ہے۔ میرے سامنے والی دیوار پر ایک چھوٹی سی تصویر ہے۔ بظاہر کسی قدیم وحشی نسل کے انسان کی جو مجھ پر اپنا نیزہ تانے اور خود کو ایک خوب صورت رنگی ہوئی ڈھال کے پیچھے جہاں تک چھپ سکتا ہے چھپائے ہوئے ہے۔ جہاز کی سواری میں آدمی اکثر پوچ قسم کے تصورات کا شکار ہو جاتا ہے لیکن یہ ان سب میں پوچ ترین ہے۔ باقی میرا چوبی قفس بالکل خالی ہے۔ پہلو کی دیوار کے ایک موکھے سے جنوب کی رات کی گرم ہوا آیا کرتی ہے اور میں جہاز پر پانی کے تھپیڑے پڑنے کی آواز سنتا رہتا ہوں۔

میں یہاں اس وقت سے پڑا ہوا ہوں جب کالے جنگل میں رہنے والے شکاری گریکس کی حیثیت سے میں ایک سانبھر کے پیچھے لگا اور ایک کگار پر سے گرا تھا۔ سب کچھ بہت قاعدے سے ہوا۔ میں نے تعاقب کیا، میں گرا۔ ایک کھڈ میں میرا خون نکل گیا، میں مر گیا، اور چاہئے تھا کہ یہ جہاز مجھے دوسری دنیا میں لے جاتا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ پہلی مرتبہ میں کیسی خوشی سے اس تختہ پر دراز ہو گیا تھا۔

کوہساروں نے بھی کبھی مجھ سے ایسے گیت نہیں سُنے تھے جیسے اُس وقت ان تاریک دیواروں نے سُنے۔

میں جیتے میں بھی خوش رہا تھا اور میں مرنے میں بھی خوش تھا۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے اپنا تمام فضول بوجھ، سارے کارتوس، تھیلا اور اپنی شکاری رائفل جسے میں بڑے فخر کے ساتھ لے کر چلتا تھا، سب اُتار پھینکا تھا۔ اور میں اپنے کفن میں یوں ملبوس ہوا تھا جیسے کوئی دوشیزہ اپنے عروسی لباس میں۔ میں لیٹ گیا اور انتظار کرنے لگا۔ تب وہ سانحہ ہو گیا۔"

"ہولناک مقدر!" برگوماسٹر نے مدافعانہ انداز میں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "اور اس میں تمھارے سر کوئی الزام نہیں؟"

"کوئی نہیں۔" شکاری نے کہا۔ "میں ایک شکاری تھا۔ اس میں کوئی گناہ تھا؟ شکاری کی حیثیت سے کالے جنگل میں، جہاں ابھی تک بھیڑیے موجود تھے، میں اپنے پیشے کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ میں گھات میں بیٹھتا تھا، نشانہ لگاتا تھا، اپنے شکار کو مار دیتا تھا، شکار کی کھال اُتارتا تھا، اس میں کوئی گناہ تھا؟ میری محنت کی داد ملتی تھی۔ کالے جنگل کا عظیم شکاری میرا نام پڑ گیا تھا۔ اب اس میں کوئی گناہ تھا؟"

"یہ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے!" برگوماسٹر بولا۔ "تاہم میرے نزدیک بھی ایسی باتوں میں کوئی گناہ نہیں۔ لیکن پھر، آخر خطا کس کی ہے؟"

"جہاز والے کی۔" شکاری نے کہا۔ "جو کچھ میں یہاں کہہ رہا ہوں کوئی اُسے پڑھے گا نہیں، کوئی میری مدد کو آئے گا نہیں، حتیٰ کہ اگر تمام خلقت کو میری مدد پر

مقرر کر دیا جائے۔ تب بھی ہر دروازہ اور ہر کھڑکی بند پڑی رہے ہر ایک اپنے بستر میں گھس جائے اور سر سے چادر تان لے، ساری دنیا ایک شب سرائے بن جائے۔ اور بات سمجھ میں آنے والی ہے اس لیے کہ کسی کو میرا پتا نہیں اور اگر کسی کو میرا پتا ہو بھی تو اُسے یہ نہ معلوم ہو گا کہ میں کہاں ملوں گا، اور اگر اس کو یہ معلوم بھی ہو جائے کہ میں کہاں ملوں گا تو اُس کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ میرا کیا کیا جائے، اس کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ میری مدد کس طرح کرے۔ میری مدد کرنے کا خیال ایک ایسی بیماری ہے جس کے علاج کے لیے بستر میں گھس رہنا پڑتا ہے۔

مجھے یہ معلوم ہے اور اسی لیے میں مدد حاصل کرنے کے لیے بلاتا نہیں، حالانکہ کبھی کبھی۔ جب مجھے اپنے اوپر قابو نہیں رہتا، جیسے مثال کے طور پر اسی وقت۔ میں اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہوں۔ لیکن ایسے خیالات کو دور بھگانے کے لیے مجھے بس اپنے چاروں طرف دیکھ لینا اور یہ تحقیق کر لینا ہوتا ہے کہ میں کہاں ہوں، سیکڑوں برس سے کہاں ہوں۔"

"عجیب و غریب۔" برگو ماسٹر نے کہا۔"عجیب و غریب۔ اور اب تم یہاں ریوا میں ہمارے ساتھ رہنے کو سوچ رہے ہو؟"

"میں نہیں سوچتا۔" شکاری مسکرا کر بولا، اور اپنی برأت کے لیے اس نے برگو ماسٹر کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔"میں یہاں ہوں، اس سے زیادہ میں جانتا نہیں، اس سے آگے میں بڑھ نہیں سکتا۔ میرے جہاز میں سُکّان نہیں، اور اس کو وہ ہوا ہنکائے پھرتی ہے جو موت کے پاتالوں میں چلتی ہے۔"

گیلری میں

اگر سرکس میں کسی مریل مدقوق سی کرتب دکھانے والی کو کوئی کوڑا گھماتا ہوا بے درد رنگ ماسٹر کسی بدلگام گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھا کر مجبور کرتا کہ وہ کبھی سیر نہ ہونے والے تماشائیوں کے سامنے مہینوں تک رُکے بغیر چکر پر چکر لگائے جائے، گھوڑے پر زناٹے کے ساتھ گھومتی رہے، بوسے اُچھالتی رہے، اُس کی کمر جھٹکے کھاتی رہے؛ اور اگر ایسا لگتا کہ یہ تماشا اُکتا دینے والے مستقبل کے لامتناہی راستے پر اسی طرح چلتا رہے گا، اور اسی طرح آرکسٹرا گرجتا رہے گا، اور ہوادان بھنبھناتے رہیں گے، اور تماشائیوں کی تالیوں کا رہ رہ کے دبتا اور پھر سے اُبھرتا ہوا شور کانوں میں ہتھوڑے چلاتا رہے گا، تب، شاید، گیلری کا کوئی نوجوان تماشائی ساری قطاروں کے زینے پھلانگتا ہوا اُترتا، رنگ میں گھس جاتا اور آرکسٹرا کے بھونپوؤں میں دم توڑتے ہوئے نغمے کے بیچ ہی میں چیخ کر کہتا۔ "بند کرو!"

لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے؛ ایک میدے شہاب کی سی رنگت والی خوبصورت بی بی کے لیے دو مغرور وردی پوش ملازم پردے سرکاتے ہیں اور وہ اُن کے درمیان سے خراماں خراماں نمودار ہوتی ہے؛ رنگ ماسٹر اُس کی نظر پڑتے ہی مؤدب ہو کر کسی پالتو جانور کی سی جاں نثاری دکھاتا ہوا اُس کی طرف لپکتا ہے۔ اُسے

اتنی آہستگی سے اُٹھا کر ابلق گھوڑے پر بٹھاتا ہے جیسے وہ اُس کی چہیتی پوتی ہو اور کسی خطرناک سفر پر روانہ ہو رہی ہو۔ وہ اپنے کوڑے سے سگنل دیتے ہچکچاتا ہے، بالآخر خود پر قابو حاصل کر کے کوڑا زور سے پھٹکار دیتا ہے، گھوڑے کے ساتھ ساتھ منہ کھولے دوڑے جاتا ہے، سوار کی ہر جست پر چوکسی کے ساتھ نظر رکھتا ہے، اس کی فنی مہارت کو قریب قریب ناقابلِ یقین پاتا ہے، اس کو خبردار کرنے کے لیے انگریزی کے نعرے لگاتا ہے، حلقہ بردار سائیسوں کو ڈپٹ ڈپٹ کر قریب رہنے کی تاکید کرتا جاتا ہے، بڑی قلابازی سے پہلے ہاتھ اوپر اُٹھا کر آرکسٹرا کو خاموش کراتا ہے، آخر میں ننھی بی بی کو اس کے کانپتے ہوئے گھوڑے سے پر اُتارتا ہے، اس کے گلوں پر پیار کرتا ہے اور تماشائیوں کے تمام شورِ تحسین کو بس یوں ہی سا کافی سمجھتا ہے؛ اور خود وہ بی بی اس کا سہارا لے کر، غبار کے بادلوں میں پنجوں کے بل کھڑی ہوئی، ہاتھ پھیلائے ہوئے اور چھوٹا سا سر اٹھلائے ہوئے، پورے سرکس کو اپنی فتح میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہے۔

چونکہ ایسا ہے، اس لیے گیلری کا تماشائی اپنے سامنے کے کٹہرے پر چہرہ ٹیک دیتا ہے، اختتامی موسیقی میں یوں ڈوب جاتا ہے جیسے خواب میں، اور نادانستہ روتا ہے +

ایک قدیم مخطوطہ

ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ملک کے دفاعی نظام میں بہت سی کوتاہیاں رہنے دی گئی ہیں۔ اب تک ہم نے اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا اور اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگے رہتے تھے لیکن حال میں جو باتیں ہونے لگی ہیں انھوں نے ہمیں تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔

شاہی محل کے سامنے والے چوک میں میری جوتے بنانے کی دوکان ہے۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ جوں ہی میں دوکان کھولتا ہوں مجھے چوک کو آنے والی ہر سڑک کے ناکے پر مسلح سپاہی تعینات نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے سپاہی نہیں ہیں۔ بظاہر یہ شمال کے صحرانشین ہیں۔ کسی ایسے طریقے سے جو میری سمجھ سے باہر ہے، یہ صحرانشین دارالسلطنت کے اندر گھس آئے ہیں، حالانکہ دارالسلطنت سرحد سے بہت فاصلے پر ہے۔ کچھ بھی ہو، یہ سپاہی یہاں موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر صبح ان کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

جیسی کہ ان کی سرشت ہے، یہ کھلے آسمان کے نیچے پڑاؤ ڈالتے ہیں، اس لیے کہ انھیں مکانوں سے نفرت ہے۔ یہ سپاہی تلواروں پر باڑھ رکھنے، تیروں کی نوکیں بنانے اور گھڑسواری کی مشقیں کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ یہ پرامن چوک جس کی صفائی

ستھرائی کا ہمیشہ خاص خیال رکھا جاتا تھا، اس کو ان صحرائیوں نے صحیح معنوں میں اصطبل بنا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ کچھ وقفے کے بعد ہم لوگ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی دوکانوں سے جھپٹ کر باہر نکلیں اور کم از کم بد ترین ہی غلاظتوں کو مٹا دیں۔ لیکن ایسا بھی کم ہو پاتا ہے اس لیے کہ ہماری محنت کا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور اس کے علاوہ اس کوشش میں اس کا بھی اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ہم گھوڑوں کی ٹاپوں تلے نہ آجائیں یا کوڑوں کی مار سے اپاہج نہ ہو جائیں۔

ان صحرائیوں سے گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ ہماری زبان نہیں جانتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی اپنی زبان بھی برائے نام ہی ہے۔ اُن کا آپس میں بولنے کا انداز بہت کچھ کوّوں سے ملتا ہوا ہے۔ کوّوں کی تیز کریہہ چیخ کی سی کوئی نہ کوئی آواز برابر ہمارے کانوں میں آتی رہتی ہے۔ ہمارا رہن سہن اور ہمارے رسم و رواج اُن کی سمجھ میں نہیں آتے، اور اُن کو انھیں سمجھنے کی فکر بھی نہیں ہے، اسی لیے اگر ہم اُن سے اشاروں میں بات کرتے ہیں تو وہ اسے بھی سمجھنے پر تیار نہیں ہوتے۔ آپ اُن کے سامنے اشارے کرتے رہیے۔ یہاں تک کہ آپ کے جبڑے بیٹھ جائیں اور کلائیوں کی ہڈیاں اُتر جائیں، پھر بھی وہ آپ کی بات نہیں سمجھیں گے، کبھی نہیں سمجھیں گے۔ اکثر وہ طرح طرح کے منھ بنانے لگتے ہیں۔ اُس وقت اُن کی پتلیاں پھر جاتی ہیں اور اُن کے ہونٹوں پر جھاگ آجاتا ہے، لیکن اس سے ان کی مراد کچھ نہیں ہوتی، دھمکی بھی نہیں۔ وہ ایسا بس اس لیے کرتے ہیں کہ یہی اُن کی فطرت ہے۔ اُن کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے لے لیتے ہیں۔ آپ اس کو استحصال بالجبر بھی نہیں کہہ سکتے۔ بس وہ کسی چیز پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں اور آپ چُپ چاپ وہ چیز اُن کے لیے چھوڑ کر الگ ہٹ جاتے ہیں۔

میرے یہاں سے بھی وہ بہت سا بڑھیا مال لے چکے ہیں۔ لیکن میں اس کی شکایت بھی نہیں کر سکتا اس لیے کہ میں دیکھتا ہوں کہ مثلاً قصاب ہی بیچارے پر کیا گزرتی ہے۔ جیسے ہی وہ گوشت لے کر آتا ہے وحشی سارے کا سارا گوشت اس سے لپک لیتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ان کے گھوڑے بھی خوب گوشت کھاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گھوڑا اور سوار دونوں برابر برابر لیٹے ہیں اور گوشت کا ایک ہی لوتھڑا، ایک اس سرے سے، ایک اُس سرے سے بھنبھوڑ رہے ہیں۔ قصاب کے اوسان گم ہیں لیکن اُس کی اتنی ہمت نہیں پڑتی کہ گوشت لانا بند کر دے۔ ہم لوگ بہرحال اس کی مشکل سمجھتے ہیں اور اس کے لیے کام چلانے بھر روپے کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ اگر ان وحشیوں کو گوشت نہ ملے تو نہ جانے وہ کیا سوچیں۔ یوں بھی جب کہ ان کو روزانہ گوشت مل رہا ہے معلوم نہیں وہ کیا سوچتے ہوں۔

ابھی کچھ دن ہوئے قصاب کو خیال آیا کہ اور کچھ نہیں تو جانور کاٹنے ہی کے جھنجھٹ سے چھٹکارا پا لیا جائے، چنانچہ ایک صبح وہ ایک زندہ بیل لے آیا۔ لیکن ایسا کرنے کی جرأت وہ پھر کبھی نہ کرے گا۔ میں اپنے سارے کپڑوں، کمبلوں، گدّوں میں سر دیے دوکان کے اندر فرش پر پورے ایک گھنٹے تک پڑا رہا تھا، محض اس لیے کہ مجھے مرتے ہوئے بیل کا ڈکرانا نہ سنائی دے جس پر وحشی ہر طرف سے ٹوٹے پڑ رہے تھے اور اس کا جیتا گوشت دانتوں سے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ خاموشی ہو جانے کے بہت دیر بعد میں باہر آنے کی ہمت کر سکا۔ وہ سب کے سب چھک کر بیل کے ڈھانچ کے ارد گرد پڑے ہوئے تھے جیسے شراب کے پیپے کے گرد شرابی۔

یہی وہ موقع تھا جب مجھے خیال سا ہوا کہ میں نے حقیقۃً بادشاہ سلامت کو محل کے ایک دریچے میں کھڑے دیکھا ہے۔ عام طور پر وہ محل کے اندر والے باغ میں گزارتے ہیں۔ لیکن اِس موقعے پر وہ ایک دریچے میں کھڑے ہوئے تھے۔ یا کم از کم مجھ کو ایسا ہی لگا۔ اور سر جھکائے دیکھ رہے تھے کہ اُن کے محل کے سامنے کیا ہو رہا ہے۔

"آخر ہونا کیا ہے؟ ہم سب خود سے پوچھتے ہیں۔" ہم کب تک یہ بوجھ اور اذیت اٹھا سکتے ہیں۔ شہنشاہ کے محل نے اِن وحشیوں کو یہاں کھینچ بلایا ہے لیکن اب اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ان کو واپس کیوں کر بھگایا جائے۔ پھاٹک بند پڑا ہے۔ فوجی محافظ جو ہمیشہ اونچی بن کر باہر نکلا کرتے تھے اب سلاخوں دار کھڑکیوں کے پیچھے رہتے ہیں۔ ملک کی حفاظت ہم کاریگروں اور بیوپاریوں پہ چھوڑ دی گئی ہے۔ لیکن یہ کام ہمارے بس کا نہیں ہے، نہ کبھی ہم نے اس کی اہلیت کا دعویٰ کیا۔ یہ کوئی نہ کوئی غلط فہمی ہے اور یہی ہم کو تباہ کر کے رہے گی۔..

پاس سے گزرنے والے

جب آپ رات کو کسی سڑک پر ٹہلنے کے لیے نکلتے ہیں اور خاصے فاصلے پر سے دکھائی دیتا ہوا۔ اس لیے کہ سڑک پہاڑی کو جاتی ہے اور پورا چاند نکلا ہوا ہے۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا آپ کی سمت آتا ہے تو آپ اسے پکڑ نہیں لیتے اگر وہ کوئی ناتواں شکستہ حال انسان ہے تب بھی نہیں، اگر کوئی اس کے پیچھے شور مچاتا ہوا دوڑ رہا ہے تب بھی نہیں۔ آپ اس کو نکل جانے دیتے ہیں۔

اس لیے کہ رات کا وقت ہے، اور اگر آپ کے سامنے سڑک، چاندنی میں پہاڑی کو جاتی ہے تو اس میں، آپ کیا کریں۔ اور علاوہ بریں ہو سکتا ہے کہ ان دونوں نے یہ بھاگ دوڑ محض تفریحاً شروع کی ہو، یا شاید وہ دونوں مل کر کسی تیسرے کا پیچھا کر رہے ہوں، شاید پہلا والا آدمی بے قصور ہو اور دوسرا والا اس کو قتل کرنا چاہتا ہو اور آپ اس کی اعانت کر بیٹھیں، شاید اُن دونوں کو ایک دوسرے کی خبر بھی نہ ہو اور وہ سونے کے لیے اپنے اپنے گھروں کو لپکتے جا رہے ہوں، شاید وہ دونوں آوارہ گرد ہوں، شاید پہلا والا آدمی مسلح ہو۔

اور بہر صورت کیا آپ کو تھک جانے کا حق نہیں ہے؟ کیا آپ بے تحاشا شراب نہیں پیتے رہے ہیں؟ آپ شکر کرتے ہیں کہ دوسرا والا آدمی آپ کی نظروں سے کب کا اوجھل ہو چکا ہے۔

خانہ دار کی پریشانیاں

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ "اودرادِک" اصلاً سلانی زبان کا لفظ ہے اور اسی بنیاد پر وہ اس کی تاویل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس کی اصل جرمن ہے اور سلانی زبان کا اس پر صرف اثر پڑا ہے۔ ان دونوں تاویلوں کے تذبذب کی وجہ سے یہ نظریہ قائم کر لینا بے جا نہ ہوگا کہ اِن میں سے کوئی بھی تاویل درست نہیں ہے، علی الخصوص جب کہ کوئی بھی تاویل اِس لفظ کے قابلِ قبول معنی نہیں بتاتی۔

بے شک اگر اودرادِک نام کی ایک مخلوق کا وجود نہ ہوتا تو کسی کو ان بحثوں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ مخلوق پہلی نظر میں ستارے کی شکل کی دھاگا لپیٹنے والی چپٹی پھرکی سی لگتی ہے، اور واقعی اس پر کچھ دھاگا لپٹا ہوا معلوم بھی ہوتا ہے۔ اصل میں یہ مختلف میل کے رنگ برنگے دھاگے کے الگ الگ ٹکڑے سے ہیں جن میں فقط گانٹھیں ہی نہیں ہیں بلکہ یہ ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے بھی ہیں۔ لیکن یہ محض پھرکی نہیں ہے، اس لیے کہ اس ستارے کے وسط میں ایک تیلی گھُسی ہوئی ہے اور اِس تیلی میں ایک اور ڈنڈی کھڑی کھڑی جُڑی ہوئی ہے۔ ایک طرف اِس دوسری ڈنڈی اور ایک طرف ستارے کے کسی ایک کونے کی مدد سے یہ پوری چیز اس طرح سیدھی ٹکی رہتی ہے جیسے دونوں ٹانگوں

پر کھڑی ہو۔

یہ مان لینے کو جی چاہتا ہے کہ کبھی اس مخلوق کی کوئی معقول شکل رہی ہو گی اور اب یہ اسی کا ٹوٹا پھوٹا بقایا ہے۔ تاہم یہ حقیقت نہیں معلوم ہوتی، کم سے کم اِس میں اِس طرح کی کوئی علامت نہیں ہے۔ اس کی سطح پر کہیں کوئی ٹوٹ پھوٹ یا کھُردرا پن نہیں جس سے اِس بات کا اشارہ مل سکے۔ یہ پوری چیز واہیات سی تو ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن اپنی جگہ پر یہ بالکل صحیح و سالم ہے۔ بہرحال قریب سے اس کا معائنہ کرنا ممکن نہیں، اس لیے کہ اودرادِک بے حد پھُرتیلا ہے اور اس کو پکڑا نہیں جا سکتا۔

وہ کبھی کوٹھے کے سب سے اوپر والے کمرے سے جھانکتا ہے، کبھی زینے سے، کبھی دالان سے، کبھی ڈیوڑھی سے۔ اکثر وہ مہینوں تک نظر نہیں آتا، قیاس کہتا ہے کہ اِن دنوں وہ دوسرے مکانوں میں رہنے لگتا ہوگا، لیکن وہ پابندی کے ساتھ پلٹ کر ہمارے ہی گھر آ جاتا ہے۔ بسا اوقات جب آپ دروازے سے نکل رہے ہوتے ہیں اور وہ آپ سے کچھ نیچے پر جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑا ہوا ملتا ہے تو آپ کا جی اُس سے باتیں کرنے کو چاہنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ اُس سے مشکل سوال نہیں پوچھتے۔ وہ اتنا ننھا منا سا ہے کہ آپ اس کو بچہ سمجھنے پر مجبور ہیں۔

"کہو بھئی تمھارا نام کیا ہے؟" آپ اس سے پوچھتے ہیں۔

"اودرادِک۔" وہ کہتا ہے۔

"اور تم رہتے کہاں ہو؟"

"کوئی ایک ٹھکانا نہیں۔" وہ کہتا ہے اور ہنسنے لگتا ہے، لیکن یہ ہنسی

ایسی ہوتی ہے جس کا پھیپھڑوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں سوکھے پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ کی سی آواز ہوتی ہے۔ اور عموماً اسی کے ساتھ یہ گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ان جوابوں کا بھی ہمیشہ ملنا ضروری نہیں۔ اکثر وہ عرصے تک چُپ سادھے رہتا ہے اور بالکل اپنے جسم کی طرح لکڑی ہو جاتا ہے۔

میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں، یوں ہی بے مقصد، کہ اس کا ہونا کیا ہے، کیا اس کے مرنے کا امکان ہے؟ ہر مرنے والی چیز کا زندگی میں کوئی مقصد ہوتا ہے، کوئی نہ کوئی کام ہوتا ہے جو بالآخر ختم ہو جاتا ہے لیکن اودرادک پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ ایک نہ ایک وقت آئے گا جب وہ میرے بچّوں اور میرے بچّوں کے بچّوں کی ٹانگوں تلے زینوں پر لڑھکتا پھرے گا اور دھاگوں کے سِرے اُس کے پیچھے پیچھے گھسٹ رہے ہوں گے؟ وہ کسی کو نقصان پہنچاتا نظر تو نہیں آتا لیکن یہ خیال کہ اغلباً وہ میرے بعد تک زندہ رہے گا مجھے اذیت ناک سا معلوم ہوتا ہے۔

○

بے خیالی میں کھڑکی سے دیکھنا

آخر یہ بہار کے دن جو سر پر چلے آرہے ہیں ہم ان کا کیا کریں؟
آج سویرے سویرے آسمان کا رنگ مٹیالا تھا لیکن اب اگر آپ کھڑکی پر جاتے ہیں تو آپ کو تعجب ہوتا ہے اور آپ دریچے کے کھٹکے پر اپنا رخسار رکھ دیتے ہیں۔

سورج ڈوب چلا ہے۔ لیکن نیچے وہ آپ کو ایک ننھّی بچی کا چہرہ دمکاتا نظر آتا ہے جو ادھر ادھر دیکھتی ہوئی گھوم رہی ہے اور ٹھیک اُسی وقت آپ نیچے سے اُس کی طرف بڑھتے ہوئے ایک آدمی کی پرچھائیں سے اُس کو گہناتے دیکھتے ہیں۔

اور پھر آدمی آگے نکل جاتا ہے اور ننھّی بچی کا چہرہ دمک اُٹھتا ہے۔

حویلی کے پھاٹک پر دستک

گرمی کا موسم تھا، تپتا ہوا دن۔ اپنی بہن کے ساتھ گھر لوٹتے ہوئے میں ایک بہت بڑے مکان کے پھاٹک کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اب میں یہ نہیں بتا سکتا کہ میری بہن نے پھاٹک پر شرارتاً دستک دے دی تھی یا بے خیالی میں اُس کی طرف اپنا ہاتھ صرف بڑھایا تھا اور دستک سرے سے دی ہی نہیں تھی۔

سڑک یہاں سے بائیں کو مُڑ گئی تھی اور اس سڑک پر کوئی سو قدم آگے بڑھ کر گاؤں شروع ہوتا تھا۔ ہم اس سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ لیکن ابھی ہم گاؤں کے پہلے مکان سے آگے نکلے ہی تھے کہ لوگ سامنے آ آ کر دوستانہ یا خبردار کرنے کے انداز میں ہمیں اشارے کرنے لگے۔ وہ خود بھی سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے، خوف سے جُھکے جاتے تھے۔ جس حویلی سے گزر کر ہم آ رہے تھے وہ اس کی طرف اشارہ کرتے اور یہ جتاتے تھے کہ ہم نے اس پھاٹک پر دستک دے دی ہے۔ حویلی کا مالک ہم پر یہی جُرم عائد کرے گا جس کی تفتیش فوراً شروع ہو جائے گی۔

میں نے اپنے اوسان بحال رکھے اور اپنی بہن کو بھی دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اوّل تو اُس نے پھاٹک پر ہاتھ مارا ہی نہیں، اور اگر مارا

بھی تو اسے کبھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات میں نے اپنے چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں کو بھی سمجھانا چاہی۔ انھوں نے میری بات سُن تو لی مگر اس پر کوئی رائے ظاہر کرنے سے احتراز کیا۔ پھر انھوں نے مجھے بتایا کہ صرف میری بہن ہی پر نہیں بلکہ اس کی بھائی کی حیثیت سے مجھ پر بھی جرم عاید کیا جائے گا۔ میں سر جھٹک کر مسکرا دیا۔ ہم سب مُڑ کر حویلی کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے کوئی دور پر دھوئیں کا بادل دیکھے اور اس میں سے شعلے بھڑک اُٹھنے کا انتظار کرے۔

اور واقعی ذرا ہی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ پاٹوں پاٹ کُھلے ہوئے پھاٹک میں گھوڑے سوار داخل ہو رہے ہیں۔ گرد اُڑنے لگی اور سب کچھ اُس کے پیچھے چھپ گیا، صرف اونچے اونچے نیزوں کے پھل چمکتے رہے۔ اور ابھی یہ سوار حویلی کے صحن میں غائب ہوئے ہی تھے کہ شاید انھوں نے اپنے گھوڑے پھیر لیے کیونکہ اب وہ سیدھے ہماری طرف آرہے تھے۔ میں نے اپنی بہن سے کہا کہ یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ مجھے چھوڑ کر جانے پر راضی نہ ہوئی۔ میں نے اُس سے کہا کہ کم از کم اپنے کپڑے ہی بدل ڈالو تاکہ بہتر لباس میں اِن سواروں کا سامنا کر سکو۔ آخر وہ مان گئی اور ہمارے گھر کو جانے والی سڑک پر چلی کھڑی ہوئی۔ اتنی دیر میں سوار ہمارے برابر پہنچ گئے۔ اور اترنے سے پہلے ہی پہلے انھوں نے میری بہن کو پوچھا۔ اس سوال کا سوچا سمجھا ہوا جواب یہ تھا کہ اس وقت تو وہ موجود نہیں ہے لیکن تھوڑی دیر میں آجائے گی۔ سواروں نے اِس جواب کو بے اعتنائی سے سُنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ کو پا لینا اُن کے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ایک چاق چوبند نوجوان جو منصف تھا اور اُس کا خاموش طبع نائب جس کا نام عثمان تھا، یہ دونوں بظاہر

اِس دستے کے سربراہ تھے۔

مجھ کو گاؤں کی سرائے میں چلنے کا حکم دیا گیا۔ سر جھٹک جھٹک کر اور زیر جامہ سنبھال سنبھال کر میں دھیرے دھیرے اپنا بیان دیتے لگا جس کے دوران میں دستے کی تیز نظریں مجھے ٹٹولتی رہیں۔ مجھ کو ابھی تک یقین سا تھا کہ شہر کا باشندہ اور عزت دار ہونے کی بنا پر مجھے دیہاتیوں کی اِس جماعت سے چھٹکارا دلانے کے چند لفظ کافی ہوں گے۔ لیکن جب میں نے سرائے کی دہلیز پر پاؤں رکھا تو منصف جو پہلے ہی سے وہاں پہنچ کر میرا انتظار کر رہا تھا، بولا:

"واقعی مجھے اس شخص کی حالت پر افسوس ہے"۔ اور اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس سے اُس کی مراد میری موجودہ حالت نہیں بلکہ کوئی ایسی بات تھی جو مجھے پیش آنے والی تھی۔

وہ جگہ سرائے کے کمرے سے زیادہ کسی قیدخانے کی کوٹھری معلوم ہوتی تھی۔ پتھر کی بڑی بڑی سِلوں کا فرش، سیاہ اور بالکل ننگی دیواریں جن میں سے ایک میں لوہے کا حلقہ جڑا ہوا۔ بیچ میں بچھی ہوئی ایک چیز، کچھ بستر کی سی، کچھ جراحی کی میز کی سی۔

کیا اب میں زندان کی فضا کے سوا کسی اور فضا کی تاب لا سکتا ہوں؟ اصل سوال یہی ہے، یا شاید ہوتا، بشرطیکہ مجھے اب بھی امید ہوتی کہ میں یہاں سے نکل سکوں گا۔

( )

پُل

میں سردی سے اکڑ گیا تھا۔ میں ایک پُل تھا۔ میں ایک درّے پر پڑا ہوا تھا۔ میرے پیر درّے کے ایک طرف تھے، ہاتھوں کی انگلیاں دوسری طرف جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو بھربھری مٹّی میں مضبوطی کے ساتھ بھینچ رکھا تھا۔ میرے دونوں پہلوؤں پر میرے کوٹ کے دامن پھڑپھڑا رہے تھے۔ نیچے بہت دور پر مچھلیوں سے بھرا ہوا برفیلا چشمہ غُرّا رہا تھا۔

اس ناقابلِ گزر بلندی تک کوئی مسافر بھٹک کر نہیں آتا تھا۔ ابھی پُل کسی نقشے میں پایا بھی نہیں جاتا تھا۔ اس لیے میں پڑا تھا اور انتظار کر رہا تھا۔ میں انتظار ہی کر سکتا تھا۔ ایک بار بن جانے کے بعد کسی بھی پل کو بنے رہنے کے سوا چارہ نہیں تاوقتیکہ وہ گر نہ جائے۔

یہ ایک دن قریبِ شام کا ذکر ہے۔ وہ پہلی شام تھی۔ یا وہ ہزارویں شام تھی۔ میں کہہ نہیں سکتا۔ میرے خیالات ہمیشہ پراگندہ اور ایک دائرے میں گھومتے رہتے تھے۔ یہ گرمیوں کے موسم میں قریبِ شام کا ذکر ہے۔ چشمے کی غرّاہٹ بڑھ گئی تھی۔ اُس وقت میں نے انسانی قدموں کی آہٹ سُنی۔ میری طرف آتی ہوئی، میری طرف آتی ہوئی۔ پُل! یہ مسافر جو تمھارے حوالے کیا جا رہا ہے اس کو سنبھالنے کے لیے استوار ہو جاؤ۔ بے جنگلے کی مُنڈیر دا

تیار رہو۔ اگر اس کے قدم بہکیں تو خاموشی سے انھیں ہموار کر دو، اگر وہ گرنے لگے تو دکھا دو کہ تم کیا ہو اور کسی کوہستانی دیوتا کی طرح اُسے زمین کی طرف اُچھال دو۔

وہ آگیا۔ اُس نے اپنے عصا کی فولادی نوک سے مجھے کھٹ کھٹایا۔ اُس نے اپنے عصا کی نوک سے میرے کوٹ کے دامنوں کو اُٹھایا اور درست کر دیا۔ اُس نے اپنے عصا کی نوک میرے گھنیرے بالوں میں ڈال دی اور دیر تک وہیں رہنے دی۔ وحشت زدہ ہو کر چاروں طرف دیکھتے وقت وہ یقیناً مجھ کو فراموش کر چکا تھا۔ لیکن جب میں پہاڑ اور وادی میں اس کے بھٹکتے ہوئے خیالات کا پیچھا کر رہا تھا تو اچانک وہ دونوں پیروں سے اُچھلا اور میرے بدن کے بیچوں بیچ میں کود پڑا۔ میں درد کی ٹیس سے تھرا کر رہ گیا۔ وہ کیا تھا؟ کوئی بچہ؟ کوئی خواب؟ کوئی راہ گیر؟ کوئی خودکشی کرنے والا؟ کوئی فریبی؟ کوئی تخریب کار؟ اور اُسے دیکھنے کے لیے میں گھوم پڑا۔ پل کا گھوم پڑنا! ابھی میں پوری طرح گھومنے بھی نہ پایا تھا کہ گرنے لگا۔

میں گر گیا۔ اور دم بھر میں اُن نکیلی چٹانوں نے چھید چھید کر میرے چیتھڑے اُڑا دیے جو بہتے پانی سے منھ نکالے ہر وقت چپ چاپ مجھے تکتی رہتی تھیں۔

بالٹی سوار

سارا کوئلہ ختم، بالٹی خالی، بیلچہ بے مصرف، آتش دان ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہوا، کمرہ منجمد ہوتا ہوا، کھڑکی کے باہر پتیاں ٹھٹھری ہوئی، پالے میں لپٹی ہوئی، آسمان ہر اُس شخص کے مقابلے پر روپہلی سپر بنا ہوا جو اس سے مدد کا طلب گار ہو۔

مجھے کوئلہ مہیا کرنا ہوگا۔ میں اکڑ کر نہیں مر سکتا۔ میرے پیچھے بے رحم آتش دان ہے۔ میرے آگے بے رحم آسمان ہے۔ تو مجھے ان دونوں کے درمیان سے گزرنا چاہیے اور اِس سفر میں کوئلے والے سے کمک لینا چاہیئے مگر اس نے تو اب معمولی درخواستوں پر کان دھرنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے اس کے سامنے ناقابلِ تردید طور پر ثابت کر دینا چاہیے کہ میرے پاس کوئلے کا ایک ریزہ بھی نہیں رہ گیا ہے، کہ میرے لیے اُس کی ہستی ایسی ہی ہے جیسے آسمان پر سورج۔ مجھے ایسا بھکاری بن کے پہنچنا چاہیے جو کسی دروازے کے سامنے ہی جان دے دینے پر تُلا ہوتا ہے، اور اس کے گلے میں موت کی خرخراہٹ شروع ہو جاتی ہے۔ اور اسی لیے شرفا کا باورچی اُسے کافی کی کیتلی میں سے تلچھٹ دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی ہونا چاہیے کہ کوئلے والا غصے میں بھر جانے کے باوجود "تو کسی کی جان نہیں لے گا" کے مقدس حکم کا پاس کرتے ہوئے ایک بیلچہ بھر کوئلہ میری بالٹی میں پھینک دے۔

وہاں میرے پہنچنے کا ڈھنگ ایسا ہونا چاہیے جو معاملہ طے ہی کر دے۔ اِس لیے میں بالٹی پر سوار ہو کر نکلتا ہوں۔ بالٹی پر بیٹھا ہوا، ہاتھ بالٹی کے کنڈے پر جو لگام کی سادہ ترین قسم ہے۔ میں بمشکل خود کو ٹھیلتا ہوا سیڑھیوں سے اترتا ہوں۔ لیکن

ایک بار نیچے پہنچ کر میری بالٹی بڑے ٹھاٹھ سے اوپر اُٹھنے لگتی ہے، بڑے ٹھاٹھ سے۔ زمین پر بیٹھے ہوئے اونٹ بھی ساربان کی جھڑیاں کھاکر جھرجھری لیتے ہوئے اس سے زیادہ پُروقار انداز میں نہیں اُٹھتے۔ سخت یخ بستہ سڑکوں پر سے ہم سبک رفتاری کے ساتھ گزرتے ہیں۔ اکثر تو میں مکانوں کی پہلی منزل کی بلندی تک اٹھتا چلا جاتا ہوں۔ میں دروازوں کی پستی تک کبھی نہیں اُترتا۔ اور آخر کار میں کوئلے والے کے محرابی چھت سے ڈھکے ہوئے تہ خانے پر کی غیر معمولی بلندی تک تیر آتا ہوں۔ دوکاندار کو میں دیکھتا ہوں کہ میز کے سامنے سکڑا ہوا بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے۔ اس نے فاضل گرمی کو نکالنے کے لیے دروازہ کھول رکھا ہے۔

"کوئلے والے!" میں پکارتا ہوں۔ کہر نے میری آواز کھوکھلی کردی ہے اور میری سانس کے بنائے ہوئے بادل نے اُسے ڈھانپ رکھا ہے، "کوئلے والے! مہربانی کر کے مجھے تھوڑا سا کوئلہ دے دو۔ میری بالٹی اتنی ہلکی ہو چکی ہے کہ میں اس پر سواری کر سکتا ہوں۔ مہربانی کرو۔ جب بھی مجھ سے ہو سکا میں تمھیں قیمت ادا کر دوں گا۔"

دوکان دار اپنے ایک کان پر ہاتھ رکھتا ہے:

"کیا مجھے ٹھیک سنائی دے رہا ہے؟" وہ پیچھے بیٹھی ہوئی اپنی بیوی سے پوچھتا ہے۔ "کیا مجھے ٹھیک سنائی دے رہا ہے؟ کوئی گاہک؟"

"مجھے تو کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔" اس کی بیوی کہتی ہے۔ بنائی کرتے ہوئے وہ سکون کے ساتھ سانسیں بھر رہی ہے۔ آگ اُس کی پیٹھ کو بڑے مزے میں سینک رہی ہے۔

"ہاں ہاں سنو تو سہی" میں چلاتا ہوں۔ "یہ میں ہی ہوں، پرانا گاہک، سچا اور کھرا گاہک، البتہ اس وقت محتاج ہوں۔"

"بیوی۔" کوئلے والا کہتا ہے۔ "کوئی ہے۔ بالکل ہے۔ میرے کان اتنا دھوکا تھوڑی دے

سکتے ہیں۔ ضرور کوئی پرانا گاہک ہے، کوئی بہت پرانا گاہک جو مجھ سے اس طرح منت کر رہا ہے۔"

"کیوں پریشان ہو رہے بھلے آدمی؟" اس کی بیوی ذرا دیر کے لیے کام چھوڑ کر کہتی ہے۔ اور بنائی کا سامان اپنے سینے سے بھینچ لیتی ہے۔ "کوئی بھی نہیں ہے، سڑک سونی پڑی ہے۔ ہمارے سب گاہکوں کو مال پہنچ چکا ہے۔ اب تو ہم کئی دن تک دکان بند کر کے آرام کر سکتے ہیں۔"

"لیکن میں یہاں اوپر بیٹھا ہوں، بالٹی پر۔" میں چیخ کر کہتا ہوں اور بے حس جمے ہوئے آنسو میری نظروں کو دھندلا دیتے ہیں۔ "خدا کے لیے ادھر اوپر دیکھو۔ صرف ایک بار۔ میں تمھیں فوراً دکھائی دے جاؤں گا۔ میں منت کرتا ہوں۔ صرف ایک بیلچہ بھر۔ اور اگر کچھ زیادہ دے دو تو خوشی سے پاگل ہو جاؤں۔ تمام دوسرے گاہکوں کو مال پہنچ چکا ہے۔ مجھے بالٹی میں کوئلے کی کھڑکھڑاہٹ سننے ہی بھر کو مل جاتی۔"

"میں آرہا ہوں۔" کوئلے والا کہتا ہے اور اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھنے چلتا ہے۔ لیکن اتنے میں اس کی بیوی اس کے برابر پہنچ جاتی ہے، اس کا شانہ پکڑ کر کھینچتی ہے اور کہتی ہے:

"یہیں ٹھہرو تم! تمھارا وہم نہیں جاتا تو میں خود جا کر دیکھے لیتی ہوں۔ رات کس بری طرح کھانس رہے تھے، اس کا تو خیال کرو۔ گاہک کا وہم بھی ہو جائے تو بیوی بچوں کو بھول بھال کر اپنے پھیپھڑے بھینٹ چڑھانے پر تل جاتے ہو۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔"

"تو اسے بتا ضرور دینا کہ ہمارے پاس کون کون سا کوئلہ موجود ہے۔ میں یہیں سے پکار پکار کر دام بولتا جاؤں گا۔"

"اچھا اچھا!" اس کی بیوی سیڑھیاں چڑھ کر سڑک پر آتے ہوئے کہتی ہے۔ ظاہر ہے وہ مجھے فوراً دیکھ لیتی ہے۔

"کوئلے والی! میں چلاتا ہوں، میرا سلام قبول ہو۔ بس ایک بیلچہ بھر کوئلہ، اسی

بالٹی میں، میں خود اسے گھر لے جاؤں گا۔ سب سے گھٹیا میں کا بس ایک بیلچہ بھر۔ میں پورے دام دوں گا، ظاہر ہے، مگر ابھی نہیں، ابھی نہیں۔"

یہ "ابھی نہیں"۔ کے الفاظ کیسے گھنٹی کی طرح بجتے ہیں! کیسے چکرا دینے والے انداز میں یہ الفاظ قریبی گرجا گھر کے مینار سے آتی ہوئی شام کے گجر کی جھنکار میں مل جاتے ہیں۔

"ارے بھئی، اسے کیا چاہیے؟" دوکان دار پکار کے پوچھتا ہے۔

• کچھ بھی نہیں"۔ اس کی بیوی پکار کے جواب دیتی ہے "یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے تو نہ کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ نہ سنائی دے رہا ہے۔ چھ کا گھنٹہ بج رہا ہے، بس اب دوکان بند کرنا چاہیے۔ بلا کی سردی ہے۔ کل کبھی کاروبار سے فرصت ملنا مشکل ہی ہے۔"

اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا، کچھ سنائی نہیں دیتا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے سینہ بند کی ڈوریاں کھولتی ہے اور مجھے ہنکا دینے کے لیے سینہ بند کو ہوا میں گھماتی ہے۔ بد قسمتی سے وہ کامیاب ہو جاتی ہے۔ میری بالٹی میں عمدہ گھوڑے کی ساری خوبیاں موجود ہیں، سوا مزاحمت کی قوت کے، وہ اس میں نہیں ہے۔ میری بالٹی بہت ہلکی ہے، اتنی کہ ایک عورت کا سینہ بند اُسے ہوا میں اُڑا سکتا ہے۔

"خبیث عورت!" میں جاتے جاتے چلاّتا ہوں اور وہ مڑ کر دوکان میں داخل ہوتے ہوتے تحقیر اور اطمینان کے ملے جلے انداز میں مٹھی بھینچ کر ہوا میں لہراتی ہے۔

"خبیث عورت! میں نے تجھ سے فقط ایک بیلچہ بھر سب سے بدتر کوئلہ مانگا، اور تو نے وہ بھی نہ دیا۔"

اور یہ کہہ کر میں برف پوش پہاڑوں کے علاقے کی سمت پرواز کرتا ہوں اور ہمیشہ کے لیے کھو جاتا ہوں۔

( )

ایک عام خلفشار

ایک عام تجربہ، اس کے نتیجے میں ایک عام خلفشار۔

الف کو ب کے ساتھ مقام ج پر کچھ اہم تجارتی معاملت کرتا ہے۔ ابتدائی بات چیت کے لیے وہ مقام ج جاتا ہے۔ وہ دس منٹ میں راستہ طے کر لیتا ہے اور واپسی میں بھی اُسے اتنا ہی وقت لگتا ہے۔ واپس آ کر گھر والوں کو وہ اپنی اس مہم کا حال فخریہ انداز میں بتاتا ہے۔

دوسرے دن وہ پھر مقام ج جاتا ہے۔ اس مرتبہ سودا پکا کرنے کے لیے۔ سفر کا انداز بالکل وہی ہے، کم از کم الف کے خیال میں وہی ہے، جو ایک دن پہلے اختیار کیا گیا تھا، لیکن اس بار اس کو ج تک پہنچنے میں دس گھنٹے لگتے ہیں۔ جب وہ شام کے وقت تھکا ہارا وہاں پہنچتا ہے تو اس کو بتایا جاتا ہے کہ ب اس کے نہ آنے سے آدھے گھنٹے پہلے خود اس کے قصبے کی طرف روانہ ہو چکا ہے اور یہ کہ سڑک پر وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس سے ہو کر گزرے ضرور ہوں گے۔ الف کو انتظار کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے لیکن کاروبار کی دُھن میں وہ فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اپنے گھر کی طرف لپکتا ہے۔

اس بار اُس کا سفر ایک سکنڈ میں طے ہو جاتا ہے لیکن وہ خود اس بات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کرتا۔ گھر پہنچ کر اُسے پتہ چلتا ہے کہ ب تو بہت

سویرے، اُس کے روانہ ہوتے ہی، آ گیا تھا۔ گھر کے دروازے پر اُلف سے اُس کی ملاقات بھی ہوئی تھی اور اُس نے معاملت کی یاد دہانی بھی کی تھی لیکن اُلف نے جواب میں عدیم الفرصتی اور جانے کی جلدی کا عذر کر دیا تھا۔

بہر حال اُلف کے اس ناقابلِ فہم رویّے کے باوجود ب اُس کی واپسی کے انتظار میں رُکا رہا تھا۔ اُس نے کئی بار دریافت تو ضرور کیا کہ اُلف واپس لوٹا یا نہیں، تاہم وہ اب بھی اوپر اُلف کے کمرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ ب نے فوری ملاقات اور ہر بات کی صفائی پیش کر دینے کا موقع مل جانے پر خوشی سے نہال ہو کر الف تیزی سے زینے چڑھنے لگتا ہے۔ وہ اوپر تک آ پہنچا ہے کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ اُس کی ایک نس چڑھ جاتی ہے۔ اور اس وقت جب کہ تکلیف کی شدت سے اُس پر غشی طاری ہو رہی ہے، وہ چیخ بھی نہیں سکتا، وہ اندھیرے میں صرف دھیرے دھیرے کراہ سکتا ہے، اس کو ــــ معلوم نہیں بہت دور پر یا بالکل نزدیک سے ــــ ب کی آواز سنائی دیتی ہے جو بڑے طیش کے عالم میں پیر پٹختا ہوا زینوں سے اُترتا ہے اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔

ایک چھوٹی سی کہانی

"افسوس!" چوہے نے کہا۔ "دُنیا روز بروز چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ شروع شروع میں تو یہ اتنی بڑی تھی کہ مجھے خوف آتا تھا۔ میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، اور جب آخر کار مجھ کو دور پر داہنے بائیں دیواریں دکھائی دینے لگیں تو میں بہت خوش ہوا تھا۔ لیکن یہ لمبی دیواریں اس قدر تیزی سے تنگ ہوئی ہیں کہ سرکتے سرکتے اب میں آخری کوٹھری میں آ پہنچا ہوں، اور اس کوٹھری کے اُس سرے پر چوہے دان لگا ہوا ہے جس میں مجھ کو داخل ہونا ہی پڑے گا۔"

"تم کو صرف اپنا رُخ بدل دینا ہے۔" بلّی نے کہا اور اُسے کھا گئی۔

دوغلا

○

میرے پاس ایک عجیب الخلقت جانور ہے، آدھا بلی، آدھا بھیڑ کا بچہ۔ یہ میرے باپ کا ترکہ ہے لیکن یہ بڑھا میرے ہی زمانے میں ہے۔ پہلے یہ بلی کم اور بھیڑ بہت زیادہ تھا۔ اب یہ دونوں میں برابر برابر بٹا ہوا ہے۔ اس کا سر اور پنجے بلی کے سے ہیں، جسامت اور بناوٹ بھیڑ کی سی۔ آنکھیں اس نے دونوں سے لی ہیں جو وحشت زدہ اور رنگ بدلتی رہتی ہیں، اور بال بھی جو نرم اور بہت گھنے ہیں اور چال ڈھال بھی جس میں قلانچیں بھرنا اور دبک کر چلنا دونوں شامل ہیں۔ دھوپ میں یہ کھڑکی کی چوکھٹ پر گٹھری بنا پڑا خرخر کیا کرتا ہے۔ باہر میدان میں یہ باؤلا سا بھاگتا پھرتا ہے اور بڑی مشکل سے پکڑ میں آتا ہے۔ یہ بلیوں سے بھڑکتا ہے اور بھیڑ کے بچوں پر حملہ کرنے چلتا ہے۔ چاندنی راتوں میں اسے کھپریلوں پر گھومنا بہت پسند ہے۔ یہ بلی کی بولی نہیں بول پاتا اور چوہوں سے گھن کھاتا ہے۔ مرغیوں کے ڈربے کے پاس یہ گھنٹوں گھات لگائے بیٹھا رہ سکتا ہے لیکن ابھی تک اس نے دوسرے کی جان لینے کے موقعوں کو ہاتھ سے نکل جانے دیا ہے۔

میں اس کو دودھ دیتا ہوں۔ یہ غذا اسے سب سے زیادہ راس

معلوم ہوتی ہے۔ اپنے دندوں کے سے دانتوں کے درمیان سے دودھ کے لمبے لمبے گھونٹ بھرتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ یہ بچّوں کے لیے بڑے تماشے کی چیز ہے۔ اتوار کی صبح کا وقت اِن ملاقاتیوں کے لیے مخصوص ہے۔ میں اس ننھے جانور کو اپنے گھٹنوں پر لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور پڑوس کے سارے بچّے مجھے گھیر لیتے ہیں۔

پھر عجیب ترین سوال پوچھے جاتے ہیں جن کا کوئی بھی انسان جواب نہیں دے سکتا۔ ایسا جانور صرف ایک ہی کیوں ہے، یہ جانور دنیا بھر میں میرے ہی پاس کیوں ہے، کسی اور کے پاس کیوں نہیں ہے، کیا ایسا کوئی جانور اس سے پہلے بھی کبھی ہوا ہے، اور اگر یہ مر گیا تو کیا ہوگا۔ اکیلے اس کا دل تو نہیں گھبراتا، اس کے بچّے کیوں نہیں ہیں، یہ کیا کہلاتا ہے، وغیرہ۔

میں کبھی جواب دینے کی تکلیف نہیں کرتا بلکہ کوئی مزید وضاحت کیے بغیر اپنے مال کی نمائش پر اکتفا کرتا ہوں۔ کبھی کبھی بچّے اپنے ساتھ بلیاں لے آتے ہیں۔ ایک بار تو وہ دو بھیڑ کے بچّے اُٹھا لائے۔ لیکن اُن کی اُمید کے برخلاف جانوروں میں باہمی شناسائی کے کوئی آثار نہیں پائے گئے۔ وہ چپ چاپ ایک دوسرے کو حیوانی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ اور ظاہرا انھوں نے ایک دوسرے کے وجود کو ایک خدا ساز حقیقت کی طرح تسلیم کر لیا۔

میرے گھٹنوں پر بیٹھ کر اس جانور کو نہ ڈر لگتا ہے اور نہ کسی کے پیچھے دوڑنے کی ہوس ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ مزہ اس کو مجھ سے

جھٹنے ہی میں آتا ہے۔ یہ ہمارے گھرانے کا، جس نے اس کی پرورش کی ہے: وفادار ہے، لیکن یہ کسی خاص وابستگی کی علامت نہیں بلکہ یہ ایک ایسے جانور کی سچی جبلّت ہے جس کے سوتیلے رشتہ دار تو دنیا میں بہت ہیں لیکن سگا شاید کوئی نہیں۔ لہٰذا جو تحفّظ اس کو ہمارے یہاں نصیب ہے اسے یہ اپنے حق میں برکت سمجھتا ہے۔

کبھی کبھی تو مجھے بڑی ہنسی آتی ہے جب یہ مجھے چاروں طرف سے سونگھتا پھرتا ہے اور میری ٹانگوں میں گول مول ہو کر پڑتا ہے اور پھر کسی طرح مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا۔ بھیڑ اور بلّی ہونے پر قناعت کرنے کے بجائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتّا بننے پر بھی تُلا ہوا ہے۔ ایک بار، جیسا کہ اکثر لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، میں کچھ کاروباری دشواریوں اور اُن سے پیدا ہونے والے مسائل میں بری طرح اُلجھ گیا اور میں نے ہر چیز کو تج دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اسی کیفیت میں اپنے کمرے کے اندر جھولا کرسی میں پڑا ہوا تھا۔ جانور میرے گھٹنوں پر تھا۔ میری نظر نیچے پڑی تو دیکھا کہ اس کی مونچھ کے لمبے لمبے بالوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ یہ میرے آنسو تھے یا جانور کے آنسو تھے، کیا بھیڑ کی روح والی اس بلّی کے دل میں انسانی جذبات بھی تھے؟ مجھے اپنے باپ سے زیادہ میراث نہیں ملی لیکن یہ ترکہ دیکھنے کے قابل ہے۔

اس میں دونوں جانوروں کا اضطراب ہے۔ بلی کا بھی اور بھیڑ کا بھی، گو خود یہ جانور ایک دوسرے سے متنفائر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کھال اس کے جسم پر تنگی کرتی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ آرام کرسی پر چھلانگ مار کر میرے پاس آجاتا ہے۔ اپنی اگلی ٹانگیں میرے کندھے

پر ٹیک دیتا ہے اور اپنی تھوتھنی میرے کان سے لگا دیتا ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے۔ اور سچ مچ یہ اُس کے بعد اپنا سر گھماتا ہے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی بات نے کیا اثر کیا مجھ پر نظریں جما دیتا ہے۔ اور اس کی خاطر سے میں ایسا ظاہر کرتا ہوں کہ میں اس کی بات سمجھ گیا اور سر ہلا دیتا ہوں۔ تب یہ فرش پر کود پڑتا ہے اور خوشی سے ناچنے لگتا ہے۔

قصائی کا چھُرا شاید اِس جانور کو چھٹکارا دلا دے، لیکن میں اس کو اس سے محروم رکھوں گا اس لیے کہ یہ میرا ورثہ ہے۔ اس کو انتظار کرنا ہوگا حتّٰی کہ اُس کی جان خود ہی اس کے جسم سے نکل جائے، حالانکہ یہ کبھی کبھی مجھ کو انسان کی سی ہوشیار آنکھ سے گھورنے لگتا ہے جو مجھے وہ کام کر ڈالنے کے لیے للکارتی ہے جس کے بارے میں ہم دونوں سوچ رہے ہیں۔

لباس

○

اکثر جب میں ایسے لباس دیکھتا ہوں جن میں طرح طرح کی چُنٹیں دی ہوئی، گوٹیں لگی ہوئی اور جھالریں لگی ہوئی ہوتی ہیں' جو حسین جسموں پر نہایت چُست بیٹھتے ہیں، تو میں سوچتا ہوں کہ وہ اپنی ہمواری زیادہ عرصے تک برقرار نہ رکھ پائیں گے، اُن میں ایسی شکنیں پڑ جائیں گی جن کو استری کر کے مٹایا نہ جا سکے گا، اُن کی زردوزی پر گرد کی اتنی موٹی تہ جم جائے گی کہ اسے برش سے جھاڑا نہ جا سکے گا، اور یہ کہ کوئی بھی اس حماقت اور اس بے لطفی پر راضی نہ ہوگا کہ وہی ایک بیش قیمت جامہ سویرے تڑکے سے لے کر رات تک پہنے رہے۔

اور اس کے باوجود میں ایسی لڑکیوں کو دیکھتا ہوں جو خاصی خوبصورت ہوتی ہیں اور اپنے دل کش اعضا اور نازک جسموں اور گھنے ملائم بالوں کی نمائش کرتی پھرتی ہیں، اور پھر بھی روز مرہ روزانہ اسی قدرتی بہروپ میں نظر آتی ہیں' ہمیشہ وہی چہرہ انھیں ہتھیلیوں پر ٹکائے اسی لباس کا عکس آئینے میں ڈالا کرتی ہیں۔

البتہ کبھی کبھی رات کو کسی دعوت سے گھر واپس آنے پر آئینہ دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ جامہ گھسا پٹا، ڈھیلا ڈھالا' میلا کچیلا ہو چکا ہے اس پر اب تک معلوم نہیں کتنوں کی نظر پڑ چکی ہے اور اب شاید یہ مزید پہننے کے قابل نہیں رہا۔

قصبے کا ڈاکٹر

میں بڑی اُلجھن میں تھا۔ دس میل دور کے ایک گاؤں میں ایک
بہت بیمار مریض میری راہ دیکھ رہا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان کے تمام
وسیع خلاؤں کو تیز برفانی طوفان نے پُر کر رکھا تھا۔ میرے پاس ایک
گھوڑا گاڑی تھی، یہ بڑے پہیوں والی ہلکی گاڑی تھی جو ہماری دیہاتی
سڑکوں کے لیے بالکل مناسب تھی۔ میں پوستین میں لپٹا ہوا، آلات کا
بیگ سنبھالے چلنے کے لیے بالکل تیار صحن میں کھڑا ہوا تھا۔ مگر کوئی
گھوڑا نہیں مل رہا تھا، کوئی گھوڑا نہیں۔ میرا اپنا گھوڑا ان برفیلے جاڑوں کی
تھکان سے نڈھال ہو کر گزشتہ رات کو مر گیا تھا۔ میری خادمہ لڑکی اب
گاؤں بھر میں بھاگتی پھر رہی تھی کہ کہیں سے کوئی گھوڑا مانگے مل جائے،
لیکن محض بے کار، یہ میں جانتا تھا اور بے بسی کے عالم میں کھڑا ہوا تھا میرے
اوپر برف کی تہوں پر تہیں جمتی چلی جا رہی تھیں اور میرا جنبش کرنا مشکل سے
مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ لڑکی پھاٹک میں داخل ہوتی دکھائی دی، اکیلی،
اور اس نے لالٹین لہرا دی، ظاہر ہے ایسے وقت میں ایسے سفر کے لیے کون
اپنا گھوڑا دیتا؟ میں ایک بار پھر لپکتا ہوا صحن سے نکلا۔ مجھے کوئی چارہ کار
نظر نہ آتا تھا۔ میں نے بوکھلاہٹ میں سوروں کا باڑا جو ایک سال سے خالی
پڑا تھا، اس کے ٹوٹے پھوٹے دروازے پر ایک ٹھوکر ماری۔ دروازہ دھڑے

کُھل گیا اور اپنے قلابوں پر ادھر اُدھر گھومنے لگا۔ اس میں سے گھوڑے کی بدن کی سی بُو کا بھپکا باہر نکلا۔ اندر اصطبل کی ٹمٹماتی ہوئی لالٹین ایک رسّی میں جھول رہی تھی۔ اِس تنگ نیچی جگہ میں گھٹنوں کے بل دبکے ہوئے ایک آدمی کا نیلی آنکھوں والا کُشادہ چہرہ نظر آیا۔

"گھوڑے جوت دوں؟" اس نے رینگ کر باہر آتے ہوئے پوچھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں، میں محض یہ دیکھنے کے لیے جُھک گیا کہ باڑے کے اندر اور کیا کیا ہے۔ خادمہ لڑکی میرے برابر ہی کھڑی ہوئی تھی۔

"آپ کو تو کبھی پتا نہیں ہوتا کہ آپ کو خود اپنے گھر میں کیا ملنے جا رہا ہے"۔ وہ بولی اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

"او بھائی صاحب! او بہن جی"! سائیس نے ہانک لگائی اور دو گھوڑے، مضبوط پٹھے والے زبردست جانور۔ ٹانگیں جسموں میں بالکل سمٹی ہوئی، دونوں کے خوب صورت سر اونٹ کے سر کی طرح نیچے کو لٹکے ہوئے۔ فقط اپنی پچھاڑیوں کے بل پر کھسکتے ہوئے، دروازے کی تنگ جگہ میں بھنچ کر آگے پیچھے باہر نکلے۔ لیکن باہر آتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے، اُن کی ٹانگیں بڑھ کر سیدھی ہو گئیں اور بدن پھڑکنے لگے۔

"اس کا ہاتھ بٹاؤ"۔ میں نے کہا اور لڑکی مستعدی کے ساتھ گھوڑوں پر ساز چڑھانے میں سائیس کی مدد کرنے کو لپکی، لیکن وہ اس کے پاس پہنچی ہی تھی کہ سائیس نے اُسے دبوچ لیا اور اپنا چہرہ اس کے چہرے سے بھڑا دیا۔ وہ چیخ پڑی اور میرے پاس بھاگ آئی۔ اس کے رخسار پر دانتوں کی دو قطاروں کے سرخ نشان اُبھر آئے تھے۔

"جنگلی کہیں کا۔" میں غضبناک ہو کر دہاڑا۔ "کیا چابکیں کھانے کو جی چاہ رہا ہے؟" لیکن اُسی لمحے مجھے خیال آ گیا کہ یہ آدمی اجنبی ہے۔ میں جانتا بھی نہیں کہ یہ کہاں سے آ گیا ہے اور یہ کہ ایسے وقت میں جب اور سب لوگ جواب دے چکے ہیں یہ اپنی خوشی سے میری مدد کر رہا ہے۔ اس کو جیسے میرے خیالات کی خبر ہو گئی، اس لیے کہ اس نے میری تہدید کا ذرا بھی برا نہ مانا بلکہ اسی طرح گھوڑے کسنے میں لگا رہا اور بس ایک بار وہ میری طرف مُڑا۔

"بیٹھیے۔" تب اس نے کہا، اور واقعی سب تیار تھا۔ میں نے دیکھا، گھوڑوں کی ایسی شاندار جوڑی کبھی میری سواری میں نہیں آئی تھی، اور میں خوشی خوشی گاڑی میں بیٹھا۔

"لیکن میں چلاؤں گا، تمھیں راستہ نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔

"بالکل۔" وہ بولا۔ "میں آپ کے ساتھ چل ہی نہیں رہا ہوں۔ میں روز کے پاس رہوں گا۔"

"نہیں!" روز اس دھڑکے کے ساتھ کہ اس کی شامت آ کر رہے گی، چیختی ہوئی گھر کے اندر بھاگ گئی۔ میں نے اس کے دروازہ بند کر کے کُنڈی چڑھانے کی کھڑکھڑاہٹ سُنی، میں نے قفل میں کنجی گھومنے کی آواز سُنی۔ مزید برآں میں دیکھ رہا تھا کہ کس طرح وہ بھاگتے ہیں ڈیوڑھی اور دوسرے کمروں کی روشنیاں بجھاتی جا رہی تھی تاکہ پکڑے جانے سے بچ سکے۔

"تم میرے ساتھ چل رہے ہو۔" میں نے سائیس سے کہا۔ "ورنہ میں نہیں جاتا، میرا جانا ضروری ہی سہی، لیکن میں اس کی یہ قیمت تو دینے سے رہا کہ لڑکی کو تمھارے حوالے کر دوں۔"

"ہرُرر ــ" اُس نے کہا، تالی بجائی، اور گاڑی ہوا ہو گئی، جیسے باڑھ پر آئے ہوئے دریا میں لکڑی کا لٹھا۔ میں بس سائیس کے دھاوے سے اپنے گھر کا دروازہ چرچرا کے ٹوٹنے کی آواز ہی سن پایا اور پھر طوفان نے میرے حواس پر گھونسے مار مار کر مجھے بہرا اور اندھا کر دیا۔ لیکن یہ صرف ایک لمحے کے لیے، کیوں کہ، یوں جیسے میرے مریض کا باڑا میرے احاطے کے دروازے سے ملحق ہو گیا ہو، میں وہاں پہنچا ہوا تھا۔ گھوڑے چپ چاپ کھڑے تھے، طوفان تھم چکا تھا۔ چاندنی سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میرے مریض کے ماں باپ لپکتے ہوئے گھر سے باہر نکلے، اس کی بہن اُن کے پیچھے پیچھے، مجھ کو گاڑی میں سے قریب قریب اُٹھا لیا گیا، اُن کی دہکی بہکی باتوں کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ بیمار کے کمرے کی ہوا میں سانس لینا مشکل تھا، آتش دان پڑا دھواں دے رہا تھا، میں نے چاہا کہ کوئی کھڑکی کھول دوں، لیکن پہلے مجھے اپنے مریض کو دیکھنا پڑا۔ سوکھا، سہما، بخار بالکل نہیں، بدن نہ ٹھنڈا نہ گرم، آنکھیں خالی خالی، جسم قمیص سے محروم۔ اُس نوجوان نے پروں کی رضائی کے نیچے سے خود کو اُبھارا، اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیے اور چپکے سے میرے کان میں کہا:

"ڈاکٹر! مجھے مر جانے دو۔"

میں نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ کسی نے یہ بات سُنی نہیں تھی۔ ماں باپ خاموشی سے آگے جھکے ہوئے انتظار کر رہے تھے کہ میں کیا بتاتا ہوں۔ بہن نے میرے ہینڈ بیگ کے لیے ایک کرسی لگا دی تھی۔ میں بیگ کھول کر اپنے آلات ٹٹولنے لگا۔ نوجوان اپنی درخواست کی یاد دہانی کے لیے اپنے پلنگ پر سے

مجھے جکڑے ہوئے تھا۔ میں نے ایک موچنا اٹھایا۔ شمع کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا اور پھر واپس رکھ دیا۔

"ہاں" میں نے کافرانہ انداز میں سوچا "ایسی حالت میں دیوتا کام آتے ہیں، کھویا ہوا گھوڑا بھیج دیتے ہیں، عجلت کی وجہ سے اس کے ساتھ ایک کا اضافہ کر دیتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک عدد سائیس بھی عطا کرتے ہیں" اور اب جا کر مجھے روز کا پھر خیال آیا: میں کیا کروں، میں اسے کیوں کر بچاؤں، ایسے گھوڑے لے کر جو میرے قابو کے نہیں ہیں۔ میں دس میل کے فاصلے پر اُسے اس سائیس کے نیچے سے کس طرح گھسیٹ لوں۔ یہ گھوڑے کسی طرح اب انھوں نے اپنی باگیں ڈھیلی کر لی تھیں، باہر سے ڈھکیل کر کھڑکیاں کھول دی تھیں، نہیں معلوم کس طرح؛ دونوں اپنا اپنا سر ایک کھڑکی میں ٹھونسے ہوئے تھے، اور گھر والوں کی تحیّر زدہ چیخوں سے بے نیاز کھڑے مریض کو تک رہے تھے۔

"بہتر ہے کہ فوراً واپس چلا جائے" میں نے سوچا، جیسے گھوڑے مجھے واپسی کے سفر کے لیے بلا رہے ہوں، تاہم میں نے مریض کی بہن کو، جو سمجھ رہی تھی کہ مجھے گرمی سے چکر آ گیا ہے، اپنا سموری کوٹ اُتار لینے دیا۔ رم کا ایک گلاس میرے لیے بھرا گیا۔ مریض کے باپ نے میرا کندھا تھپتھپایا، مجھے اپنا خزانہ بخش کر وہ اس بے تکلفی کا مجاز ہو گیا تھا۔ میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اُس بڈھے کے ذہن کی تنگنائے میں یہ خیال سما گیا تھا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ چنانچہ شراب پینے سے میرے انکار کا یہی ایک سبب تھا۔ ماں بستر کے پاس کھڑی تھی اور مجھے وہاں آنے کے لیے پرچا رہی تھی۔ مجھے جھکنا پڑا۔ ایک گھوڑا چھت کی طرف منھ کر کے زور سے ہنہنایا اور میں نے نوجوان کے سینے پر اپنا سر

رکھ دیا۔ اُس کا سینہ میری گیلی ڈاڑھی کے نیچے زور زور سے ہلنے لگا۔ جو بات مجھے پہلے ہی معلوم تھی اس کی میں نے تصدیق بھی کر لی، نوجوان بالکل ٹھیک تھا۔ اُس کے دورانِ خون میں ایک ذرا سی گڑبڑ تھی، فکر کی ماری ماں نے اُسے کافی سے بھر رکھا تھا، لیکن وہ بالکل ٹھیک تھا اور سب سے بہتر یہ ہوتا کہ اُسے دھکا دے کر بستر کے باہر کر دیا جاتا! میں مصلحِ عام نہیں ہوں اس لیے میں نے اُسے پڑا رہنے دیا۔ میں ضلع کا ڈاکٹر تھا اور امکانی حد تک اپنا فرض بجا لاتا تھا، اس حد تک کہ وہ فرض قریب قریب ناقابلِ برداشت ہو جاتا تھا۔ مجھے بہت کم معاوضہ ملتا تھا پھر بھی میں مریضوں پر شفقت کرتا اور اُن کے کام آتا تھا ابھی تو مجھے روز کی سلامتی کی تدبیر کرنا تھی، پھر نوجوان جس طرح چاہتا رہ سکتا تھا اور میں بھی مر سکتا تھا۔ میں وہاں اس لامتناہی جاڑے میں کیا کر رہا تھا! میرا گھوڑا مر گیا تھا اور گاؤں کا کوئی متنفس مجھے دوسرا گھوڑا مستعار دینے پر تیار نہ تھا۔ مجھے اپنی جوڑی سور باڑے میں سے نکالنا پڑی، اگر کہیں یہ جوڑی گھوڑوں کی نہ نکلی ہوتی تو مجھے خنزیروں کی سواری کرنا پڑتی۔ یہ حالت تھی۔ اور میں نے اس کنبے سے ہاں کر دی۔ ان لوگوں کو اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا، اور اگر معلوم بھی ہو جاتا تو انھیں اعتبار نہ آتا۔ نسخے لکھنا آسان ہے لیکن لوگوں سے مفاہمت دشوار ہے۔ خیر، اب مجھے چل دینا چاہیے تھا، ایک بار پھر مجھے بلا ضرورت بلوا لیا گیا تھا، میں اس کا عادی تھا، ضلعے بھر نے میرے دروازے کی گھنٹی بجا بجا کر میرا جینا عذاب کر دیا تھا، لیکن یہ کہ اس بار مجھے ساتھ میں روز کو بھی بھینٹ چڑھانا ہو گا۔ وہ حسین لڑکی جو برسوں سے میرے گھر میں رہتی آئی تھی اور میں اس سے

قریب قریب بے خبر تھا۔ یہ قربانی بہت زیادہ تھی، اور مجھے کسی بھی طرح اپنے ذہن میں اس کی کوئی نہ کوئی تاویل کرنا تھی تاکہ اچانک میرا غصہ اس خاندان پر نہ اُترے جو اپنی بہترین خواہشوں کے باوجود میرے لیے روز کو نہیں لا سکتا تھا۔ لیکن جب میں نے اپنا بیگ بند کیا اور اپنا سموری کوٹ پہننے کے لیے ہاتھ بڑھایا، اس دوران میں خاندان کے سب لوگ ساتھ مل کر کھڑے رہے تھے۔ باپ اپنے ہاتھ والے رم کے گلاس کو سونگھ رہا تھا، ماں بظاہر مجھ سے مایوس ہوکر۔ لوگ نہ جانے کیا کیا اُمیدیں باندھ لیتے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو بھرے اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ بہن ایک خون میں تربتر رومال کو جھٹک رہی تھی، تب کسی طرح میں مشروط طور پر یہ ماننے کو تیار ہوگیا کہ بایں ہمہ ہوسکتا ہے کہ نوجوان بیمار ہو۔ میں اُس کی طرف بڑھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے یوں خیرمقدم کیا گویا میں اس کے لیے نہایت قوت بخش پرہیزی یخنی لا رہا ہوں۔ اُف، اب دونوں گھوڑے ایک ساتھ ہنہنا رہے تھے، یہ آواز میں سمجھتا ہوں کہ مریض کے معائنے میں مدد دینے کے لیے آسمان سے مقدر ہوئی تھی، اور اس بار مجھے پتہ چلا کہ نوجوان واقعی بیمار تھا، اس کے داہنے پہلو میں کولھے کے قریب میری ہتھیلی کے برابر کھلا ہوا زخم تھا، مختلف طرح کے ہلکے اور گہرے سُرخ رنگ کا، گہرائی میں گہرا سُرخ، کناروں پر ہلکا سُرخ، کچھ کچھ گڈنڈ آیا ہوا، خون کے بے ترتیب تختے جمے ہوئے، یوں کھلا ہوا جیسے دن کی روشنی میں مستطیل کان۔ ایسا تو وہ کچھ فاصلے سے دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن قریب سے جائزہ لینے پر ایک اور پیچیدگی نظر آئی۔ میں حیرت کے مارے آہستہ سے سیٹی بجائے بغیر نہ رہ سکا۔ کیڑے میری چھنگلیا کے اتنے موٹے اور لمبے، خود گہرے سُرخ رنگ کے اور اُن پر خون کی چھیٹیاں بھی پڑی ہوئی،

چھوٹے چھوٹے سفید سر اور بہت سی مُنّی مُنّی ٹانگیں، زخم کی گہرائی میں بنائے ہوئے اپنے گھر سے نکل نکل کر کلبلاتے ہوئے روشنی کی طرف چلے آرہے تھے۔ بے چارہ نوجوان، اس کا علاج ممکن نہ تھا۔ اس کے پہلو کا یہ شگوفہ اسے ختم کیے دے رہا تھا۔ گھر والے خوش تھے، انھوں نے مجھے اپنے کام میں لگتے دیکھا، بہن نے ماں کو بتایا، ماں نے باپ کو بتایا، باپ نے اُن ڈھیر بھر مہمانوں کو بتایا جو کُھلے ہوئے دروازے پر پڑتی ہوئی چاندنی میں سے ہو ہو کر، پنجوں کے بل چلتے ہوئے اور توازن قائم رکھنے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے اندر آرہے تھے۔

"تم مجھے بچا لوگے؟" نوجوان نے سسکی بھر کر سرگوشی کی۔ میرے ضلعے کے لوگ اسی طرح کے ہیں، ڈاکٹر سے ہمیشہ ناممکنات کی توقع کرنے والے۔ وہ اپنے قدیم معتقدات کو ہاتھ سے کھو چکے ہیں، پادری گھر میں بیٹھا رہتا ہے اور ایک ایک کرکے اپنی عبا قبا وغیرہ اُتارا کرتا ہے، لیکن ڈاکٹر اور اس کے دستِ شفا کو قادرِ مطلق ٹھہرایا جاتا ہے۔ خیر، جو اُن کی مرضی، میں نے اُن پر کوئی اپنی خدمات مسلّط تو کی نہیں ہیں، اگر وہ کسی کارِ خیر کے لیے نیک نیتی کے ساتھ مجھ پر زیادتی کرتے ہیں تو میں بھی اپنے ساتھ یہ سلوک ہونے دیتا ہوں۔ مجھ بوڑھے قصباتی ڈاکٹر کو جس سے اُس کی ملازمہ چھین لی گئی ہو، اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے۔ اور اس لیے وہ لوگ آئے، گھر والے اور گاؤں کے بڑے بوڑھے، اور میرے کپڑے اُتارنے لگے۔ مکان کے سامنے ایک اسکول کی کورس پارٹی، ٹیچر کی سربراہی میں یہ بول نہایت ہی سادہ دُھن میں گانے لگی:

اس کے کپڑے اُتارو۔ تب ہی یہ ہمارا علاج کرے گا

اور اگر نہ کرے، اسے مار کے ڈال دو!

جرّاح ہی تو ہے، جرّاح ہی تو ہے۔

تب میرے کپڑے اُتر گئے اور میں اُن لوگوں کی طرف خاموشی سے دیکھنے لگا۔ میری انگلیاں میری داڑھی میں تھیں اور میرا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ میرے اوسان بالکل بجا تھے اور میں اِس صورتِ حال کا سامنا کر سکتا تھا اور کرتا رہا۔ بہرحال میرے لیے اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس لیے کہ اب اُن سب نے مجھے سر اور پیروں سے پکڑ لیا تھا اور مجھے بستر کی طرف لیے جا رہے تھے۔ انھوں نے مجھ کو بستر پر دیوار سے ملا کر لٹا دیا، زخم کی جانب۔ پھر وہ سب کمرے سے نکل گئے، دروازہ بند کر دیا گیا۔ گانا رُک گیا، ...... بادلوں نے چاند کو ڈھک لیا۔ بستر میرے گرد گرم تھا، کھلی ہوئی کھڑکیوں میں گھوڑوں کے سر پر چھائیوں کی طرح ہل رہے تھے۔

"تمھیں پتا ہے!" ایک آواز نے میرے کان میں کہا۔ "مجھے تمھارے اوپر بہت کم بھروسا ہے۔ تمھیں یہاں لا کر پھینک دیا گیا ہے، تم اپنے پیروں سے تھوڑی آئے ہو۔ میرے کام آنے کے بجائے تم مجھے میرے بسترِ مرگ پر پیسے ڈال رہے ہو۔ میرا جی تو یہی چاہ رہا ہے کہ تمھاری آنکھیں کھُرچ کر نکال لوں۔"

"درست!" میں نے کہا۔ "بات تو بڑے شرم کی ہے۔ اور میں پھر بھی ڈاکٹر ہوں۔ میں کیا کروں؟ یقین کرو، مجھے خود بھی کوئی بہت اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

"کیا مجھے بس اِس معذرت پر صبر کر لینا ہے؟ اُف، مجھے یہی کرنا ہوگا، اس کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے ہمیشہ سب کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔ لے دے کر ایک عمدہ سا زخم ہے جو میں دُنیا میں لایا ہوں۔ میرے لیے بس اسی کو مقدر کیا گیا ہے۔"

"میرے دوست!" میں نے کہا۔ "تمھاری غلطی یہ ہے، تمھاری نگاہ میں وسعت

نہیں۔ میں دور و نزدیک کے تمام مریضوں کے یہاں جا چکا ہوں، اور میں تم کو بتاتا ہوں: تمھارا زخم کوئی ایسا بہت خراب نہیں ہے۔ کسی تنگ گوشے میں تیشے کی دو ضربتوں سے آیا ہے۔ بہت سے لوگ اپنا پہلو پیش کر دیتے ہیں اور جنگل میں تیشے کی آواز اُنھیں بمشکل سُنائی پڑتی ہے اور اس کا تو اُنھیں اور بھی کم احساس ہوتا ہے کہ آواز اُن کے قریب تر آتی جا رہی ہے۔"

"واقعی ایسا ہی ہے یا تم مجھے بخار میں آکر بہکا رہے ہو؟"

"واقعی ایسا ہی ہے، ایک سرکاری ڈاکٹر کی پوری ذمّہ داری سے کہی ہوئی بات مانو۔"

اور اس نے بات مان لی اور چُپکا لیٹ رہا۔ لیکن اب میرے لیے فرار کی سوچنے کا موقع تھا۔ گھوڑے ابھی تک اپنی جگہ پر جمے ہوئے کھڑے تھے۔ میں نے جلدی جلدی اپنے کپڑے، اپنا سموری کوٹ، اپنا بیگ اُٹھایا، میں کپڑے پہننے میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا، گھوڑے جس رفتار سے آئے تھے اگر اسی رفتار سے گھر کو واپس جائیں تو مجھ کو فقط اس بستر سے اپنے بستر پر چھلانگ لگا دینا تھی۔ ایک گھوڑا بڑی فرماں برداری کے ساتھ کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اپنا بنڈل گاڑی میں پھینک دیا۔ سموری کوٹ کا نشانہ چوک گیا اور وہ ایک آنکڑے میں محض آستین سے اٹک کر رہ گیا۔ یہی غنیمت تھا۔ میں نے خود ایک گھوڑے پر جست لگا دی۔ برف میں باگیں گھسٹتی ہوئی، ایک گھوڑا دوسرے کے ساتھ یوں ہی سا بندھا ہوا، پیچھے پیچھے گاڑی ڈگمگاتی ہوئی، میرا سموری کوٹ سب سے پیچھے۔

"ہرّرر......" میں نے کہا، لیکن گھوڑوں نے رفتار نہیں پکڑی۔ دھیرے دھیرے

فرتوت بوڑھوں کی طرح ہم برفیلے بنجر میں رینگنے لگے۔ ہمارے پیچھے بچوں کا نیا مگر بے محل ترانہ دیر تک گونجتا رہا:

خوش ہو جاؤ، سب مریضو،!

ڈاکٹر کو تمھارے ساتھ بستر میں لٹا دیا گیا ہے!

اس رفتار سے میں کبھی گھر نہیں پہنچ سکتا۔ میرا چلتا ہوا مطب چوپٹ ہو گیا ہے، میرا جانشین میرے ساتھ خیانت کر رہا ہے، لیکن بے سود، کیوں کہ وہ میری جگہ نہیں لے سکتا۔ میرے گھر میں گرمایا ہوا سائیس بپھر رہا ہے؛ روزا اس کا شکار ہے، میں اب اس بارے میں اور کچھ سوچنا نہیں چاہتا۔ ننگا، اس بدترین دور کے پالے میں کھلا ہوا، ارضی گاڑی، غیر ارضی گھوڑوں کی سواری پر، میں اتنا بوڑھا آدمی، بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ میرا سموری کوٹ گاڑی کی پشت پر لٹک رہا ہے مگر میں اس تک پہنچ نہیں سکتا۔ اور میرے گنے چنے مریضوں میں سے کوئی انگلی تک نہیں ہلاتا۔ دغا! دغا! رات کو گھنٹی کی جھوٹی آواز کا ایک بار جواب دے دیا گیا۔ اب اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ کبھی نہیں ٭

○

درخت

ایسا ہے کہ ہم برف میں درختوں کے تنوں کی طرح ہیں۔ دیکھنے میں
وہ ڈھیلے ڈھالے پڑے ہوتے ہیں اور ایک ہلکا سا دھکّا اُنھیں
لڑھکانے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ نہیں، ایسا نہیں کیا جا سکتا۔
اس لیے کہ وہ زمین میں پیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر دیکھیے نا، خود یہ بھی
دکھاوا ہی تو ہے +

نیا وکیل

ہمارے یہاں ایک نیا وکیل آیا ہے، ڈاکٹر ئبسفیلس۔ اس کے حلیے میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے آپ کو یہ خیال آسکے کہ وہ کسی زمانے میں سکندرِ مقدونی کا گھوڑا تھا۔ ہاں، اگر آپ اس کی کہانی سے واقف ہوں تو البتہ آپ کو کچھ کچھ ایسا محسوس ہو سکتا ہے۔ لیکن ابھی ایک دن جب وہ کچہری کے اگلے سنگی زینوں پر اتنے زور زور سے چڑھ رہا تھا کہ زینے اس کے پیروں تلے گونج رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ ایک معمولی سا اردلی جو ریس میں پابندی کے ساتھ چھوٹی موٹی بازیاں لگا لگا کر گھوڑوں کو آنکنے میں خوب مشّاق ہو گیا ہے، وہ بھی اُس کا تعریفی نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا۔

مجموعی حیثیت سے وکیلوں کو اپنی جماعت میں بسفیلس کا داخل ہونا اچھا لگا ہے۔ لوگ حیرت خیز بصیرت سے کام لے کر خود سے کہتے ہیں کہ موجودہ معاشرے کا جو حال ہے اُس کو دیکھتے ہوئے بُسفیلس خاصی مشکل میں پڑا ہوا ہے، اس لیے، اور تاریخِ عالم میں اُس کی اہمیت کے لحاظ سے بھی، بُسفیلس کم از کم اِس کا حق ضرور رکھتا ہے کہ اس کا دوستانہ خیرمقدم کیا جائے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ اس زمانے میں کوئی سکندرِ اعظم نہیں ہے۔ ایسے لوگ تو بہتیرے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ لوگوں کو کس طرح ہلاک کیا جائے،

دعوت کی میز پر جا کر کسی دوست کو نیزے سے چھید دینے میں جو مہارت درکار ہوتی ہے اُس کی کمی نہیں ہے، اور بہتوں کے نزدیک مقدونیہ بہت تنگ جگہ ہے، چنانچہ وہ فیلقوس کو، جو باپ تھا، کوستے ہیں۔ لیکن ہندوستان تک کا راستہ کوئی نہیں بنا سکتا، کوئی بھی نہیں۔ خود شہنشاہ کے زمانے میں بھی ہندوستان کے دروازے دسترس سے باہر تھے، پھر بھی اس کی تلوار نے اُن تک پہنچنے کا راستہ دکھا ہی دیا۔ آج اِس سے زیادہ دور دست اور بلند مقامات کے دروازے اُتر چکے ہیں لیکن کوئی راستہ نہیں دکھاتا۔ تلواریں لے کر چلنے تو بہتیرے ہیں لیکن اُن کو صرف ہوا میں چلانے کے لیے، اور جو آنکھ ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتی ہے وہ چوندھیا کر رہ جاتی ہے۔

اس لیے شاید واقعی سب سے بہتر یہ ہے کہ وہی کیا جائے جو بسفیلس نے کیا ہے اور خود کو قانون کی کتابوں میں غرق کر دیا جائے۔ اب اگر اُس کی کمر پر کسی سوار کی رانوں کا دباؤ نہیں ہے، جنگ کے شور و غوغا سے دُور لیمپ کی پُر سکون روشنی میں وہ ہمارے قدیم مجلّدات کے اوراق دیکھتا اور پلٹتا رہتا ہے۔

اگلا گاؤں

میرے دادا کہا کرتے تھے !

" زندگی حیرت خیز حد تک مختصر ہے ۔ میں تو جب اپنی زندگی پر نظر کرتا ہوں تو یہ اتنی قلیل معلوم ہوتی ہے کہ مثال کے طور پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی نوجوان اِس اندیشے کے بغیر اگلے گاؤں کو روانہ ہونے کا ارادہ کس طرح کر سکتا ہے کہ ایسے سفر میں جتنا وقت درکار ہو گا اس کے لیے۔ حادثوں سے قطع نظر۔ ایک پوری خوش و خرّم طبیعی زندگی کی مدّت بھی کم پڑ سکتی ہے" +

گیدڑ اور عرب

ہم نخلستان میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ میرے ساتھی سو رہے تھے۔ ایک عرب کا لمبا سفید ہیولا پاس سے گزرا۔ وہ اونٹوں کی دیکھ بھال کرتا رہا تھا اور اپنے سونے کے ٹھکانے پر جا رہا تھا۔

میں گھاس پر پیٹھ کے بل دراز ہو گیا۔ میں نے سونے کی کوشش کی، نہیں سو سکا؛ دور پر ایک گیدڑ نے ہانک لگائی؛ میں پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور جو کچھ اتنی دور تھا یک بہ یک بالکل پاس آ گیا۔ گیدڑ میرے چاروں طرف پلے پڑ رہے تھے، آنکھوں کی مدھم سُنہری چمک ظاہر اور پھر غائب ہوتی ہوئی۔ لچک دار جسم بڑی چُستی اور ہم آہنگی کے ساتھ جیسے کوڑے کی پھٹکار پر جُنبش کرتے ہوئے۔

میری پُشت کی طرف سے ایک گیدڑ میری بغل کے نیچے ٹھوکا دیتا ہوا مجھ سے بالکل بھڑ کر نکلا جیسے مجھ سے گرمی حاصل کرنا چاہتا ہو، پھر وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:

"میں دور و نزدیک کا سب سے معمر گیدڑ ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ آخر کار یہاں آپ سے ملاقات ہو ہی گئی۔ میں تو قریب قریب

مایوس ہو گیا تھا، اس لیے کہ ہم لوگ قرنوں سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، میری ماں کو آپ کا انتظار رہا، اور اس کی ماں کو، اور سارے گیدڑوں کی مادرِ اوّل تک تمام ماؤں کو۔ یہ حقیقت ہے، آپ یقین کریں۔"

"تعجب ہے۔" میں نے کہا۔ مجھے اُس الاؤ کو جلانے کا بھی خیال نہیں رہا جو گیدڑوں کو بھگانے کے لیے بالکل تیار تھا، "مجھے یہ سُن کر بڑا تعجب ہوا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میں شمال سے ادھر آ نکلا ہوں، اور میں تمھارے ملک کا مختصر سا دورہ کر رہا ہوں۔ اچھا تو تم گیدڑ لوگ کیا چاہتے ہو؟"

اس نہایت دوستانہ پرسش سے جیسے گیدڑوں کی ہمت بڑھ گئی، میرے گرد اُن کا حلقہ تنگ ہو گیا۔ سب کے سب منھ کھولے ہانپ رہے تھے۔

"ہمیں معلوم ہے" سب سے زیادہ عمر والا بولا۔ "کہ آپ شمال سے آئے ہیں، اسی بات پر ہم نے اپنی اُمیدیں منحصر کی ہیں۔ آپ اہلِ شمال میں وہ فراست ہے جو عربوں میں نہیں پائی جاتی۔ مجھے کہنے دیجیے کہ ان کی ٹھس اور گستاخ فطرت میں سے فراست کی ایک چنگاری بھی نہیں نکل سکتی۔ وہ غذا کی خاطر جانوروں کو ذبح کر ڈالتے ہیں اور اُن کی آلایش کو پھینک دیتے ہیں۔"

"اتنا چلّا کر نہیں!" میں نے کہا۔ "پاس ہی عرب سو رہے ہیں۔"

"آپ واقعی یہاں اجنبی ہیں۔" گیدڑ بولا۔ "ورنہ آپ کو معلوم ہوتا کہ دنیا کی تاریخ میں کبھی کوئی گیدڑ کسی عرب سے خوف زدہ نہیں ہوا ہے۔

ہم اُن سے کیوں ڈریں، کیا یہی بدنصیبی ہمارے لیے بہت نہیں ہے کہ ہم کو ایسی مخلوق کے درمیان بن باس ملا ہے؟"

"ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔ جو معاملات میرے اپنے حلقۂ اثر سے اتنے باہر ہوں، میں اُن پر فیصلہ دینے کا مجاز نہیں ہوں، مجھے تو یہ بڑا پُرانا قضیہ معلوم ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں یہ خون میں شامل ہو چکا ہے اور شاید خون ہی کے ساتھ ختم ہو سکے"۔

"آپ نہایت سمجھدار ہیں" بوڑھے گیدڑ نے کہا، اور وہ سب اور زور زور سے ہانپنے لگے۔ اُن کے پھیپھڑوں سے ہوا باہر آنے لگی حالانکہ وہ ساکت کھڑے تھے۔ اُن کے کھُلے ہوئے جبڑوں سے ایک طرح کی بُو آ رہی تھی۔ جسے برداشت کرنے کے لیے مجھے بار بار دانت بھینچنا پڑتے تھے "آپ نہایت سمجھ دار ہیں، ابھی آپ نے جو کہا وہ ہماری قدیم روایات سے مطابقت رکھتا ہے۔ لہٰذا ہم اُن کا خون کھینچ لیں گے اور قضیہ ختم ہو جائے گا"

"اوہو!" میں نے اپنے ارادے سے زیادہ جوش کے ساتھ کہا" وہ اپنا بچاؤ کریں گے، وہ اپنی تفنگوں سے تمھیں درجنوں کے حساب میں مار گرائیں گے"۔

"آپ کو ہمارے بارے میں غلط فہمی ہے" اُس نے کہا" یہ ایک انسانی کمزوری ہے جو ظاہرا شمال بعید میں بھی جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ ہم انھیں قتل کرنے کی تھوڑی سوچ رہے ہیں۔ نیل کا سارا پانی بھی ہم کو اُن سے پاک نہیں کر سکتا۔ اُن کے تو زندہ گوشت کی جھلک ہی سے ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ دُم دبائیں اور کھُلی ہوا میں بھاگ جائیں، صحرا کی طرف، جو محض اسی سبب سے ہمارا مسکن بن گیا ہے"۔

اور آس پاس کے تمام گیدڑوں نے جن میں دور دور سے آئے ہوئے بہت سے نو وارد بھی شامل ہو گئے تھے، اپنی تھوتھنیاں اپنی اگلی ٹانگوں پر رکھ دیں اور اُنھیں پنجوں سے پونچھنے لگے۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے غُصّے کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں جو اتنا شدید تھا کہ میرا جی چاہنے لگا اُن کے سروں پر سے پھاند پھوند کر نکل جاؤں۔

"تو پھر تمھارا کیا کرنے کا ارادہ ہے"، میں نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا، لیکن میں کھڑا نہیں ہو سکا، دو کم سن گیدڑوں نے میرے کوٹ اور قمیص میں اپنے دانت گاڑ رکھے تھے، میں بیٹھے رہنے پر مجبور تھا۔

"یہ آپ کے خدّام ہیں۔" بوڑھے گیدڑ نے وضاحت کی۔ "اعزاز کی علامت۔"

"نہیں، انھیں چھوڑنا پڑے گا۔" میں کبھی بوڑھے گیدڑ اور کبھی کم سن گیدڑوں کی طرف مُڑتا ہوا چیخا۔

"بالکل چھوڑ دیں گے۔" بوڑھا والا کہنے لگا، کیونکہ آپ کی یہی مرضی ہے۔ مگر اس میں ذرا وقت لگے گا اس لیے کہ انھوں نے بہت اندر تک دانت اُتار دیے ہیں جیسا کہ ہمارا طریقہ ہے۔ جب تک آپ ہماری عرضداشت کی سماعت فرمائیں۔"

"تمھارے طرزِ عمل نے مجھے اس کو منظور کرنے کے حق میں نہیں رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کی وجہ سے آپ ہم کو بدتمیز نہ سمجھ لیجیے گا۔" وہ بولا اور اب جا کر پہلی بار اُس نے اپنی آواز کے قدرتی رونے پن سے کام لیا۔ "ہم ادنیٰ جانور ہیں، ہمارے پاس دانتوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، اچھا یا بُرا جو کام بھی کرنا ہوتا ہے ہم اپنے دانتوں ہی سے انجام دے پاتے ہیں۔"

"خیر، تو تم چاہتے کیا ہو؟" میں نے زیادہ دھیمے پڑے بغیر پوچھا۔
"حضور!" وہ چلّایا اور سارے گیدڑ مل کر چیخنے لگے۔ اس میں کسی نغمے کی برائے نام سی کیفیت تھی۔ "حضور، ہم آپ سے گذارش کرتے ہیں کہ اس قضیے کو ختم کرائیے جو دنیا کو تقسیم کیے ہوئے ہے۔ آپ عین وہی ہستی ہیں جس کے لیے ہمارے اجداد نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ کام انجام دینے کے لیے پیدا ہو گی۔ اب ہم عربوں کے ہاتھوں پریشان ہونا نہیں چاہتے، ہم سانس لینے بھر کی گنجائش چاہتے ہیں، ایسا مطلع چاہتے ہیں جو اُن سے صاف ہو۔ اُن کے ہاتھوں ذبح ہوتی ہوئی بھیڑوں کا ممیانا نہیں سُننا چاہتے۔ ہر حیوان قدرتی موت مرے، جب تک ہم مرے ہوئے ڈنگروں کو چچوڑ کر ان کی ہڈیاں صاف کر دیں اس وقت تک کوئی مداخلت نہ ہو۔ صاف سُتھری زندگی، صفائی سُتھرائی کے سوا ہم کچھ نہیں چاہتے ——" اور اب وہ سب کے سب رو رہے تھے اور سسکیاں بھر رہے تھے۔ "ایسی دُنیا میں جینا کیوں کر گوارا کر سکتا ہے، اے رحم دل، اے پاک باطن؟ نجاست اُن کا سفید ہے، نجاست اُن کا سیاہ ہے، اُن کی داڑھیاں الحذر! اُن کے حلقۂ چشم پر نگاہ پڑتے ہی تھوک دینے کو جی چاہتا ہے، اور جب وہ ہاتھ اوپر کرتے ہیں تو جہنم کی تیرگی اُن کی بغلوں میں مُنہ پھاڑے نظر آتی ہے۔ لہٰذا حضور، لہٰذا حضور والا! اپنے قوی ہاتھوں سے کام لے کر اُن کے حلقوم اس قینچی سے چیر دیجیے۔"
اور اس کے سر کی جنبش کے جواب میں ایک گیدڑ لپک کر ایک چھوٹی سلائی والی پُرانی زنگ خوردہ قینچی لیے ہوئے آیا جو اُس کی ایک کچلی میں جھول رہی تھی۔

"اخّاہ، تو آخر قینچی آہی گئی، اور یہی روک دینے کا وقت ہے"۔ ہمارے عرب قافلہ سالار نے جو ہماری طرف بڑھ آیا تھا اور اب اپنا کوڑا پھٹکار رہا تھا، چیخ کر کہا:

گیدڑ ہڑبڑا کر بھاگ کھڑے ہوئے، لیکن کچھ دور جا کر پلٹے اور جمگھٹا لگا کر کھڑے ہو گئے۔ سارے جانور اس طرح آپس میں گُتھے ہوئے تھے جیسے بیابان کی آسیبی روشنی کے ہالے نے انھیں چھوٹے سے گھیرے میں کیل کر رکھ دیا ہو۔

"تو صاحب آپ کو بھی یہ تماشا دکھایا گیا"۔ عرب نے، جس حد تک اس کی قومی کم آمیزی اجازت دے سکتی تھی، شوخی سے ہنستے ہوئے کہا:

"یعنی تم کو معلوم ہے کہ یہ جانور کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"بالکل"۔ اُس نے کہا۔ "یہ تو مشہور بات ہے، جب تک عرب ہیں یہ قینچی صحرا میں گھوم رہی ہے اور جب تک ہمارے دن پورے نہیں ہو جاتے اسی طرح ہمارے ساتھ ساتھ گھومتی رہے گی ہر یورپ والے کے آگے یہ قینچی اس امرِ عظیم کی انجام دہی کے واسطے لائی جاتی ہے، ہر یورپ والا عین وہی شخص ہوا کرتا ہے جسے مشیّت نے اُن کے لیے منتخب کیا ہوتا ہے۔ یہ جانور! ان کی اُمیدیں احمقانہ ترین ہوتی ہیں۔ یہ محض بے وقوف ہیں، ایک دم بے وقوف۔ اسی لیے تو یہ ہم کو اچھے لگتے ہیں، یہ ہمارے کتّے ہیں، آپ لوگوں کے کسی بھی کتّے سے بہتر۔ اچھا اب ذرا دیکھیے گا کل رات ایک اونٹ مرا ہے اور میں اُسے یہاں اُٹھوا لایا ہوں"۔

چار آدمی اونٹ کا بھاری مردہ اُٹھا کر لائے اور انھوں نے اُسے ہمارے سامنے ڈال دیا۔ اس کا زمین کا چھونا تھا کہ گیدڑ زور زور سے بولنے لگے۔ اُن میں سے ہر ایک نے پیٹ کے بل رینگتے ہوئے آگے کھسکنا شروع کر دیا۔

جیسے وہ کسی ڈور میں باندھ کر زبردستی گھسیٹے جا رہے ہوں۔ انھوں نے عربوں کو فراموش کر دیا تھا، اپنی نفرت کو فراموش کر دیا تھا۔ متعفن لاشے کے سب کچھ محو کر دینے والے پیش دست وجود نے اُن کو مسحور کر لیا تھا۔ ایک گیدڑ تو اونٹ کے گلے تک پہنچ کر ایک شریان میں دانت اُتار بھی چکا تھا۔ کسی تیز پچکاری کی طرح جیسے کوئی بھڑکتی ہوئی آگ بجھانے کے عزم اور اُمید کے ساتھ اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی اور کام میں لگی ہوئی تھی۔ بلک جھپکتے میں لاشے کے اوپر انبار ہو کر وہ سب ایک ساتھ جُٹے ہوئے تھے۔

اور اب قافلہ سالار نے اپنا کاٹ دار گھوڑا گھما گھما کر داہنے بائیں سے اُن کی پیٹھوں پر برسانا شروع کیا۔ انھوں نے سر اُٹھائے، وہ مزے میں آ کر متوالے ہو رہے تھے، انھوں نے عربوں کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا، اپنی تھوتھنیوں پر کوڑے کی مار محسوس کی، وہ اُچھل اُچھل کر کچھ پیچھے ہو گئے۔ لیکن اتنی دیر میں اونٹ کا خون جگہ جگہ اکٹھا ہو گیا تھا اور اُس کے ابخرات اُٹھ اُٹھ کر آسمان کی طرف جا رہے تھے۔ لاشہ جا بجا سے پھٹ کر کھل گیا تھا۔ اُن سے رہا نہیں گیا۔ وہ پھر پلٹ پڑے، عرب سالار نے ایک بار پھر کوڑا اُٹھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپ کا خیال ٹھیک ہے صاحب"۔ اس نے کہا۔ "ہم انھیں ان کے حال پر چھوڑے دیتے ہیں، اس کے علاوہ اب پڑاؤ اُٹھانے کا بھی وقت ہو رہا ہے۔ غرض یہ کہ آپ نے ان کو دیکھ لیا۔ خوب ہی جانور ہیں، ہیں نا؟ اور یہ ہم سے کیسی نفرت کرتے ہیں!"

ریڈ انڈین ہونے

کی

خواہش

کاش کوئی ریڈ انڈین ہی ہوتا، ہر دم چوکنا اور ایک دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سوار، ہوا کے سامنے جُھکا ہوا۔ مرتعش زمین کے اوپر جھٹکے کھاتا تھرتھراتا ہوا، یہاں تک کہ وہ اپنے مہمیز پھینک دیتا، اس لیے کہ مہمیزوں کی حاجت ہی نہ ہوتی، لگامیں گرا دیتا اس لیے کہ لگاموں کی حاجت ہی نہ ہوتی، اور ابھی اس نے سامنے برابر سے کٹی ہوئی جھاڑیوں والی زمین کو دیکھا ہی ہوتا کہ گھوڑے کی گردن اور سر اُڑ بھی گئے ہوتے۔

فیصلہ

(ن کے لیے ایک کہانی)

بھری بہار میں اتوار کی ایک صبح تھی۔ دریا کے کنارے ایک قطار میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے بودے مکان جن میں رنگ اور بلندی کے سوا کوئی اور فرق مشکل ہی سے نظر آتا تھا، اُن میں سے ایک کی پہلی منزل پر اپنے نجی کمرے میں ایک نوجوان تاجر جارج بنڈمان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ابھی ابھی اپنے ایک پرانے دوست کے نام جو اب پردیس میں رہنے لگا تھا خط لکھ کر ختم کیا تھا اور کھوئے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ لفافے کے اندر رکھ کر مطالعے کی میز پر کہنیاں ٹیکے کھڑکی سے باہر دریا، پُل اور اس پار کی سرسبز پہاڑیوں پر ٹکٹکی لگائے تھا۔

وہ اپنے دوست کے متعلق سوچ رہا تھا جو وطن میں اپنے مستقبل سے مطمئن نہ ہونے کی بنا پر چند سال پہلے روس بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اب وہ سینٹ پیٹرسبرگ میں کاروبار کر رہا تھا جو شروع شروع میں تو چمکا تھا لیکن اب عرصے سے بگڑتا جا رہا تھا۔ اسے جب بھی وطن آنے کا اتفاق ہوتا — اور یہ اتفاق کم سے کم تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس کی شکایت ضرور کرتا۔ غرض اس طرح وہ ایک غیر ملک میں فضول اپنی عمر گنوا رہا تھا۔ اس کی بڑی سی نامانوس داڑھی اس کے چہرے کو، جسے جارج بچپن ہی سے پہچانتا تھا، پوری طرح چھپا نہیں پائی تھی، اور اس کی رنگت ایسی پیلی ہوتی جا رہی تھی کہ خیال ہوتا تھا اُسے

اندر اندر کوئی روگ لگ گیا ہے۔ اُس کے اپنے بیان کے مطابق وہاں بسے ہوئے اپنے ہم وطنوں کی جماعت سے اُس کا کوئی مستقل رابطہ قائم نہیں تھا اور روسی کنبوں سے بھی اس کی رسم و راہ نہیں کے برابر تھی۔ چنانچہ وہ مستقل تجرّد کی زندگی پر راضی ہوتا جارہا تھا۔

ایسے آشفتہ روزگار آدمی کو، جس کے حال پر افسوس تو کیا جاسکتا ہو لیکن اس کی مدد نہ کی جاسکتی ہو، کوئی لکھتا تو کیا لکھتا۔ کیا اسے یہ مشورہ دیا جاتا کہ وطن واپس آجائے، پھر سے اپنے پاؤں جمائے اور پرانی دوستیوں کی تجدید کرے۔ اس میں کوئی رکاوٹ ہی نہ تھی۔ مجموعی حیثیت سے اپنے دوستوں کی امداد پر تکیہ کرے؛ لیکن یہ تو گویا اس کو یہ جتانا ہوتا۔ اور جتنی نرمی سے یہ بات کہی جاتی اتنی ہی دل کو ٹھیس لگاتی کہ اس کی اب تک کی تمام جہد و کوشش رائگاں گئی ہے، کہ بس اب اُسے باز آجانا چاہیے، کہ وہ وطن لوٹ آئے اور اُن نظروں کا نشانہ بنے جو اُسے انجیل کے پشیمان بیٹے کی طرح دیکھ رہی ہوں، کہ اس کے دوست ہی معاملہ شناس ہیں اور یہ کہ وہ خود محض ایک بڑا سا بچہ ہے جسے وہی کرنا چاہیے جو اس کے کامیاب اور گھر گرہست دوست تجویز کریں۔ اور با ایں ہمہ کیا یہ ضروری تھا کہ جس مقصد سے اس کو یہ تمام اذیت پہنچائی گئی ہوتی وہ مقصد حاصل بھی ہو جاتا؛ شاید اس کو وطن واپس آنے پر تیار کرلینا سرے سے ممکن ہی نہ ہو۔ وہ خود کہتا تھا کہ اب وہ وطن کے تجارتی معاملات سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ تو پھر وہ اس سب کے بعد بھی دوستوں کی نصیحت سے مکدّر اور پہلے سے بھی زیادہ اُن سے کھنچا کھنچا ایک اجنبی کی طرح پردیس میں پڑا رہے گا۔ لیکن اگر اُس نے

دوستوں کا مشورہ قبول ہی کر لیا اور اس کے بعد وطن میں کھپ نہ سکا۔ ظاہر ہے کسی کی عداوت کی وجہ سے نہیں بلکہ حالات کے دباؤ سے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ یا اُن کے بغیر بھی بسر نہ کر سکا، تبکی محسوس کرتا رہا، یہ بھی کہنے سے گیا کہ اس کے کچھ اپنے دوست یا کوئی اپنا وطن بھی ہے، تو پھر کیا اس کے لیے بہتر نہ رہا ہوتا کہ وہ جس طرح پردیس میں پڑا تھا اسی طرح پڑا رہتا؟ ان سب باتوں کے پیشِ نظر کیوں کر یقین کیا جا سکتا تھا کہ وطن میں اس کی زندگی کامیاب رہے گی؟

اس لیے بالفرض کوئی اس کے ساتھ خط کتابت رکھنا بھی چاہتا تو اس کو اس طرح کی صحیح صحیح خبریں نہیں بھیج سکتا تھا جیسی بعید ترین آشناؤں کو بے دھڑک بھیجی جا سکتی ہیں۔ اس کو آخری بار وطن آئے ہوئے تین برس سے زیادہ ہو رہے تھے اور اس کے لیے وہ روس کی سیاسی صورتِ حال کے بہت غیر یقینی ہونے کا عذرِ لنگ پیش کرتا تھا جو گویا ایک معمولی سے تاجر کو مختصر ترین مدّت کے لیے بھی باہر جانے کی اجازت نہیں دیتی تھی درحالے کہ یہی صورتِ حال ہزاروں لاکھوں روسیوں کو اطمینان کے ساتھ بیرونِ ملک جانے دیتی تھی۔ لیکن انھیں تین برسوں میں خود جارج کی زندگی کا نقشہ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ دو سال ہوئے اس کی ماں مر گئی تھی جس کے بعد سے وہ اور اس کا باپ مل کر گھرداری چلا رہے تھے، اور ظاہر ہے کہ اس کے دوست کو اس کی اطلاع کر دی گئی تھی اور اس نے خط کے ذریعے ایسے روکھے الفاظ میں اظہارِ ہمدردی کیا تھا جس سے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا کہ اس طرح کے واقعے کی الم آفرینی کا اندازہ کسی دور دراز کے ملک میں بیٹھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال اس کے بعد سے

جارج کاروبار اور دیگر تمام اُمور میں اور زیادہ منہمک ہوگیا۔

ماں کی زندگی کے دوران وہ تجارت میں زیادہ کارگزاری شاید اس لیے نہیں دکھا سکا تھا کہ اس کا باپ ہر معاملے میں اپنی مرضی چلانے پر تُلا رہتا تھا، شاید ماں کی موت کے بعد سے اس کے باپ کی جارحیت میں کچھ کمی آ گئی تھی، ہرچند کہ اب بھی تجارت میں اس کی سرگرمی برقرار تھی، شاید یہ بہت کچھ قسمت کی اتفاقی یاوری کے سبب سے ہوا ہو۔ یقیناً یہ بات بہت قرینِ قیاس تھی۔ لیکن بہرکیف ان دو برسوں کے اندر کاروبار نہایت ہی غیر متوقع طور پر چمک اُٹھا تھا۔ عملہ دوگنا کرنا پڑا تھا، آمدنی پانچ گنی ہو گئی تھی، بلاشک و شبہہ ابھی مزید ترقی کی راہ کھلی ہوئی تھی۔

لیکن جارج کے دوست کو اِس پیش رفت کی کوئی خبر نہ تھی۔ شروع کے چند برسوں میں، شاید آخری بار، اُس تعزیتی خط میں، اُس نے جارج کو روس چلے آنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی اور خصوصی طور پر جارج کے شعبۂ تجارت میں ترقی کے امکانات خوب بڑھا چڑھا کر دکھائے تھے۔ اُس نے جو اعداد و شمار پیش کیے تھے وہ جارج کے موجودہ لین دین کے آگے کچھ بھی نہیں تھے۔ تاہم وہ اپنے دوست کو اپنی کاروباری کامیابیوں سے آگاہ کرتے ہچکچاتا تھا، اور اب اگر وہ شروع سے اِس پُرانے قصّے کو چھیڑتا تو یقیناً یہ کچھ عجیب سا لگتا۔

اس لیے جارج اپنے دوست کو محض اِدھر اُدھر کی غیر اہم باتیں لکھنے پر اکتفا کیا کرتا تھا جو کسی بھی پُرسکون اتوار کو سُستی کے ساتھ سوچتے ہوئے آدمی کے ذہن میں آ جایا کرتی ہیں۔ وہ فقط یہ چاہتا تھا کہ اُس کے دوست نے اس طویل مدّت میں وطن کا جو تصوّر اپنی تسلّیِ خاطر کے لیے قائم کر رکھا ہوگا

اس کو جوں کا توں قائم رہنے دے۔ اور اس لیے ایسا ہوا کہ جارج نے تین مرتبہ خاصے خاصے وقفے سے لکھے ہوئے تین خطوں میں ایک غیر اہم شخص کی منگنی ایک اتنی ہی غیر اہم لڑکی کے ساتھ ہو جانے کا ذکر کیا، یہاں تک کہ اس کے مدعا کے خلاف اس کا دوست اِس قابلِ ذکر واقعے میں کچھ کچھ دلچسپی ظاہر کرنے لگا۔

تاہم جارج اِس قسم کی باتیں لکھنے کو اِس امر کے اعتراف پر ترجیح دیتا تھا کہ خود اس کی منگنی ایک مہینہ ہوا ایک کھاتے پیتے گھر کی لڑکی فرالین فریڈا بریڈنفلڈ کے ساتھ ہو گئی تھی۔ وہ اکثر اپنی منگیتر سے اپنے اس دوست اور اُس انوکھے رابطے کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا کرتا تھا جو خط کتابت کے ذریعہ دونوں میں پیدا ہو گیا تھا۔

"تو وہ ہماری شادی میں نہیں آ رہا ہے"۔ اس نے کہا تھا۔ "پھر بھی مجھے تمھارے سارے دوستوں سے واقف ہو جانے کا حق تو ہے ہی"۔

"میں اُسے تکلیف دینا نہیں چاہتا" جارج نے جواب دیا تھا۔ "میرا مطلب غلط نہ سمجھو۔ شاید وہ آ ہی جائے، کم سے کم میرا تو یہی خیال ہے لیکن وہ محسوس کرے گا کہ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے اور اسے اذیت ہوگی، شاید اُسے مجھ پر رشک آنے لگے، اور بے اطمینانی کا شکار تو وہ یقیناً ہو جائے گا، اور اِس بے اطمینانی کا کوئی چارہ کیے بغیر ہی اس کو پھر تنہا واپس جانا ہوگا۔ تنہا۔ تم اس کا مطلب سمجھتی ہو نا؟"

"ہاں۔ لیکن کیا اسے کسی اور طریقے سے ہماری شادی کا علم نہیں ہو سکتا؟"

"ظاہر ہے کہ میں اس کو روک نہیں سکتا، لیکن اس کی زندگی کی جو روش ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس کا امکان کم ہی ہے"۔

"جارج اگر تمھارے دوست اسی قسم کے ہیں تو تمھیں منگنی کرنا ہی نہیں چاہیے تھی۔"

"خیر، اس میں ہم دونوں ہی قصوروار ہیں۔ لیکن اب تو جو کچھ ہو گیا بس اس سے پھرنے کا نہیں۔" اور جب اس کے بوسوں تلے آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے بھی وہ یہ کہہ گئی:

"پھر بھی مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔"

تو اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنے دوست کو یہ اطلاع دے بھی دے، تو حقیقتاً اُسے کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہونا پڑے گا۔

"میں اسی قسم کا آدمی ہوں اور اُسے مجھ کو اِسی صورت میں قبول کرنا ہو گا۔" اُس نے خود سے کہا، "اس کے ساتھ مزید موافقت کی خاطر میں خود کو کسی دوسرے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا۔"

اور واقعی اس نے اتوار کی صبح کو لکھے جانے والے اس طویل خط میں اپنے دوست کو محبت میں اپنی کامیابی سے اِن الفاظ میں مطلع کر ہی دیا۔

میں نے بہترین خبر آخر کے لیے بچا رکھی ہے۔ میری منگنی ایک متموّل خاندان کی لڑکی فرالین فریڈا برینڈنفلڈ سے ہو گئی ہے۔ اس نے تمھارے جانے کے عرصے بعد یہاں کی سکونت اختیار کی ہے، اس لیے تم اسے شاید ہی جانتے ہو۔ اس کے متعلق مزید تفصیلات پھر کبھی لکھوں گا۔ آج تو میں تم کو بس اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میں بہت خوش ہوں۔ اور میرے تمھارے تعلقات میں صرف اتنا فرق ہوا ہے کہ اب

تم مجھکو ایک بالکل معمولی قسم کے دوست کے بجائے ایک
خوش و خرم دوست پاؤ گے۔ اس کے علاوہ میری منگیتر کی
صورت میں، جو تم کو بہت سلام لکھوا رہی ہے اور جلد
ہی خود بھی تمھیں خط لکھے گی تم صنف مخالف کا ایک کھرا
دوست پاؤ گے جو ایک مجرد آدمی کے لئے کوئی معمولی
بات نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے اسباب ہیں جن کی
بنا پر تم ہم سے ملنے نہیں آ سکتے۔ لیکن کیا میری شادی عین
وہ موقع نہیں ہے جس کی خاطر ان ساری رکاوٹوں کو دور
کر دیا جائے؟ بہر حال، جو بھی ہو، تم وہی کرو جو تمھیں
مناسب معلوم ہو اور اس میں اپنی مصلحت کے سوا کسی اور
بات کا لحاظ نہ کرنا۔

یہ خط ہاتھ میں لیے ہوئے جارج دیر سے مطالعے کی میز پر کھڑکی کی طرف منہ
کیے بیٹھا تھا۔ اس نے ابھی ابھی سڑک پر سے گزرتے ہوئے ایک شناسا کے سلام کا
جواب کھوئی کھوئی مسکراہٹ کے ساتھ دیا تھا۔

آخر کار اس نے خط جیب میں رکھا اور اپنے کمرے سے نکل کر چھوٹی سی غلام گردش
میں ہوتا ہوا اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ مہینوں سے نہیں گیا
تھا۔ دراصل اسے وہاں جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی اس لیے کہ کاروبار
کے سلسلے میں اس کی ملاقات روز ہی اپنے باپ سے ہوتی تھی اور دن کا کھانا
وہ دونوں ایک ہوٹل میں ساتھ ہی کھاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ شام کو دونوں
اپنے اپنے کام سے کام رکھتے تھے لیکن پھر بھی اگر جارج اپنے دوستوں کے ساتھ

نہ نکل جاتا۔ جیسا کہ اکثر ہوتا تھا۔ یا، اب ادھر کچھ دن سے، اپنی منگیتر کے پاس نہ چلا جاتا تو وہ دونوں مشترکہ دیوان خانے میں بیٹھ کر اپنا اپنا اخبار پڑھا کرتے۔

جارج کو یہ دیکھ کر تعجّب ہوا کہ اس کے باپ کا کمرہ اس چمکیلی صبح کو بھی کیسا تاریک ہے۔ تنگ صحن کے اُس سرے والی دیوار نے اس کمرے پر کچھ ایسا ہی سایہ کر رکھا تھا۔ اس کا باپ ایک گوشے میں جہاں جارج کی مرحومہ ماں کی مختلف نشانیاں آویزاں تھیں کھڑکی کے پاس بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا جسے وہ نگاہ کی کمزوری کے باعث آنکھوں کی سیدھ سے ذرا ہٹا کر تھامے ہوئے تھا۔ میز پر ناشتے کے جھوٹے برتن پڑے تھے اور بظاہر اُن میں سے زیادہ کھایا نہیں گیا تھا۔

"اوہو، جارج"۔ اس کے باپ نے یکبارگی اُٹھتے ہوئے کہا۔ وہ آگے بڑھا تو اُس کا بھاری بھرکم ڈریسنگ گاؤن کھُل گیا اور اُس کے دامن اس کے اِدھر اُدھر پھڑپھڑانے لگے۔

"میرا باپ ابھی تک دیوزاد ہے"۔ جارج نے اپنے آپ سے کہا۔ "یہاں تو ناقابلِ برداشت اندھیرا ہے"۔ وہ بلند آواز سے بولا۔

"ہاں، خاصا اندھیرا ہے"۔ اس کے باپ نے کہا۔

"اور آپ نے کھڑکی بھی بند کر رکھی ہے"۔

"مجھے اسی طرح اچھا لگتا ہے"۔

"باہر تو خوب گرمی ہے"۔ جارج گویا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا اور بیٹھ گیا۔

اُس کے باپ نے ناشتے کے برتن صاف کیے اور الماری میں رکھ دیے۔

"میں آپ کو بس یہ بتانا چاہتا تھا" جارج جو بوڑھے کے حرکات و سکنات کو بے خیالی میں دیکھ رہا تھا، کہنے لگا۔ "کہ اب میں اپنی منگنی کی خبر سینٹ پیٹرسبرگ بھیج رہا ہوں"۔ اس نے خط اپنی جیب سے تھوڑا سا نکالا اور پھر رکھ لیا۔

"سینٹ پیٹرسبرگ؟" اس کے باپ نے پوچھا۔

"اپنے دوست کو"۔ جارج نے اپنے باپ سے نظریں ملانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کاروبار کے اوقات میں تو وہ کچھ اور ہی ہوتا ہے، وہ سوچ رہا تھا، لیکن یہاں کس طرح بازو باندھے جما ہوا بیٹھا ہے۔

"اچھا، اپنے دوست کو"۔ اس کے باپ نے کچھ عجیب طرح سے زور دے کر کہا۔

"آپ کو تو معلوم ہی ہے، ابا، کہ پہلے میں اس کو اپنی منگنی کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اُسی کے خیال سے، بس یہی وجہ تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ وہ عجیب سا آدمی ہے۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کوئی اور اُسے میری منگنی کے بارے میں بتا دے، حالانکہ وہ اتنا گوشہ نشین آدمی ہے کہ اس کا امکان کم ہی ہے۔ تاہم میں اسے روک نہیں سکتا۔ لیکن میرا خود اسے بتانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"اور اب تم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے؟" اس کے باپ نے کھڑکی کی چوکھٹ پر اپنا بڑا سا اخبار ڈال دیا، اس پر اپنی عینک رکھی اور عینک کو ایک ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔

"جی ہاں، میں اس پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نے سوچا اگر وہ واقعی میرا دوست ہے تو میری منگنی کی خوش خبری سے اس کو بھی خوشی ہونا چاہیے۔ اس لیے اب میں یہ خبر اُس سے پوشیدہ نہیں رکھوں گا۔ لیکن خط کو ڈاک میں

ڈالنے سے پہلے میں چاہتا تھا آپ کو بتا دوں۔

"جارج"، اس کے باپ نے اپنا پوپلا منھ پھاڑ کر کہا "سنو! تم اس سلسلے میں میرے پاس آئے ہو اس پر مجھ سے گفتگو کرنے۔ بے شک یہ تمھاری بڑی سعادت مندی ہے۔ لیکن یہ کچھ نہیں ہے۔ اگر تم مجھے پوری بات سچ سچ نہیں بتاتے تو یہ کچھ نہیں سے بھی بدتر ہے۔ میں وہ باتیں نہیں چھیڑنا چاہتا جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں ہے۔ تمھاری ماں کے بعد سے بعض باتیں ایسی کی گئی ہیں جو ٹھیک نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کبھی اِن باتوں کے چھیڑنے کا وقت آجائے، ہو سکتا ہے ہمارے اندازے سے پہلے ہی وہ وقت آجائے۔ کاروبار میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی مجھ کو خبر نہیں، ہو سکتا ہے وہ مجھ سے چھپا کر کی گئی ہوں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ مجھ سے چھپا ہی کر کی گئی ہیں۔ اب میں اتنا کام کرنے کے قابل نہیں رہا، میرا حافظہ جواب دیتا جا رہا ہے، اب میں اتنی ساری باتوں پر نظر نہیں رکھ پاتا۔ ایک تو یہ بڑھاپے کی لعنت ہے، اور دوسرے یہ کہ ماں کی موت نے تمھیں اتنا صدمہ نہیں پہنچایا ہے جتنا مجھے پہنچایا ہے۔ لیکن چونکہ بات اس کی ہو رہی ہے، اس خط کی، اس لیے جارج میں تم سے درخواست کرتا ہوں، مجھے دھوکا مت دو۔ یہ بہت چھوٹا معاملہ ہے، یہ کوئی قابلِ ذکر معاملہ نہیں ہے، اس لیے مجھے دھوکا مت دو۔ کیا واقعی پیٹرسبرگ میں تمھارا یہ دوست ہے؟"

جارج سراسیمہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے دوستوں کی پروا نہ کیجیے۔ ایک ہزار دوست مل کر بھی میرے باپ کی جگہ نہیں لے سکتے۔ آپ جانتے ہیں میرا کیا خیال ہے؟ آپ اپنا زیادہ خیال نہیں رکھتے لیکن بڑھاپے کا خیال کرنا چاہیے۔ آپ کے بغیر مجھ سے کاروبار

نہیں چل سکتا، یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں لیکن اگر کاروبار سے آپ کی صحت پر برا اثر پڑنے لگے تو میں کل اسے ہمیشہ کے لیے بند کردینے کو تیار ہوں۔ اور اس سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں آپ کی زندگی کا انداز بدلنا ہوگا۔ آپ یہاں اندھیرے میں بیٹھے رہتے ہیں، لیکن دیوان خانے میں آپ کو کافی روشنی ملے گی۔ آپ اپنی قوت بحال رکھنے کے بجائے ناشتے کو ہاتھ لگاکر چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ کھڑکی بند کرکے بیٹھتے ہیں حالانکہ ہوا آپ کے لیے بہت مفید رہے گی۔ نہیں ابا! میں ڈاکٹر کو لاؤں گا اور ہم اسی کی ہدایتوں پر عمل کریں گے۔ آپ کا کمرہ بدلا جائے گا۔ آپ سامنے والے کمرے میں رہ سکتے ہیں، یہاں میں آجاؤں گا۔ آپ کو اس تبدیلی کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ آپ کی ساری چیزیں آپ کے ساتھ وہیں پہنچادی جائیں گی۔ لیکن یہ سب بعد میں ہوتا رہے گا، ابھی تو میں آپ کو تھوڑی دیر کے لیے بستر میں لٹاتا ہوں، مجھے یقین ہے آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ آئیے میں آپ کے کپڑے اتروادوں، آپ دیکھیے گا میں یہ سب کرسکتا ہوں۔ یا اگر آپ اسی وقت آگے والے کمرے میں جانا چاہیں تو فی الحال میرے ہی بستر پر لیٹ رہیے۔ یہ سب سے اچھا رہے گا۔"

جارج کے باپ کا سفید جھبرے بالوں والا سر اس کے سینے پر ڈھلک آیا تھا۔ جارج اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

"جارج۔" اس کے باپ نے جنبش کیے بغیر دھیمی آواز میں کہا۔

جارج فوراً اپنے باپ کے سامنے دوزانو ہوگیا۔ اسے بوڑھے کے مضمحل چہرے پر بڑی بڑی پھیلی ہوئی پتلیاں دکھائی دیں جو آنکھوں کے کونوں سے اس کو گھور رہی تھیں۔

"سینٹ پیٹرس برگ میں کوئی تمھارا کوئی دوست نہیں ہے۔ تم ہمیشہ کے

دغا باز ہو اور تم میرے ساتھ بھی دغا کرنے سے نہیں چوکے۔ وہاں تمھارا کوئی دوست کیوں کر ہو سکتا ہے؟ میں اسے مان ہی نہیں سکتا۔"

"ذرا یاد کیجیے ابا۔" جارج اپنے باپ کو کرسی سے اٹھا کر اس کا ڈریسنگ گاؤن اُتارنے لگا۔ اس کا باپ بدقت کھڑا ہو پا رہا تھا۔ "آخری بار جب میرا دوست ہم لوگوں سے ملنے آیا تھا اُسے تین برس ہونے کو ہیں۔ مجھے یاد ہے آپ اُسے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ کم سے کم دو مرتبہ میں نے آپ کی نظر اُس پر نہیں پڑنے دی تھی حالانکہ درحقیقت وہ میرے کمرے میں میرے ہی پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں بخوبی سمجھ سکتا تھا کہ آپ اسے کیوں پسند نہیں کرتے، میرے دوست کی اپنی کچھ ادائیں ہیں۔ لیکن پھر آپ کی اس سے خوب نبھنے لگی تھی۔ مجھے بڑا فخر محسوس ہوتا تھا اس لیے کہ آپ اس کی باتیں سُنتے، اس سے اتفاق رائے کرتے اور سوالات پوچھتے تھے۔ اگر آپ ذہن پر زور دیں تو آپ کو ضرور یاد آجائے۔ وہ ہمیں انقلابِ روس کے نہایت ناقابلِ یقین واقعات سُنایا کرتا تھا، مثلاً جب وہ خیوا کا تجارتی دورہ کر رہا تھا اور ایک بلوے میں پھنس گیا تھا اور اُس نے ایک بالکنی پر ایک پادری کو دیکھا تھا جس نے اپنی ہتھیلی کو کاٹ کر اس پر خون سے صلیب کا نشان بنا دیا تھا اور وہ ساہاتھ بلند کر کے مجمع کو مجھا رہا تھا۔ آپ تو خود اس وقت سے ایک دو بار یہ قصہ سُنا چکے ہیں۔"

اس اثنا میں جارج اپنے باپ کو پھر بٹھا دینے اور اس کا اونی پتلون جو وہ لینن کے زیر جامے پر پہنے تھا اور اس کی جرابیں اُتارنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ زیر جامہ کچھ صاف نہیں تھا اور اسے دیکھ کر جارج اپنی بے پروائی پر خود کو ملامت کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ یقیناً یہ دیکھنا اس کا کام ہونا چاہیے تھا کہ اس کا باپ

صاف زیر جامے بدلتا ہے یا نہیں۔ اس نے ابھی تک اپنی ہونے والی دُلہن سے اس سلسلے میں کوئی واضح گفتگو نہیں کی تھی کہ مستقبل میں اس کے باپ کے لیے کیا بندوبست کیا جائے گا اس لیے کہ دونوں نے خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر اس بات کو طے شدہ سمجھ لیا تھا کہ بڈھا پرانے مکان میں اسی طرح اکیلا رہا کرے گا۔

لیکن اب اُس نے فوری اور حتمی فیصلہ کر لیا کہ باپ کو اپنے مستقبل کے مکان میں رکھے گا، بلکہ قریب سے دیکھنے پر تو ایسا لگنے لگا کہ وہاں اپنے باپ کی جس خیال داری کا اس نے ارادہ کیا تھا اُس کا وقت آتے تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

وہ اپنے باپ کو ہاتھوں پر اُٹھا کر بستر تک لے گیا۔ یہ دیکھ کر اُس کو دہشت سی محسوس ہوئی کہ جب وہ پلنگ کی طرف بڑھ رہا تھا تو بڈھا اُس کے سینے سے لگا ہوا اس کی گھڑی کی زنجیر سے کھیل رہا تھا، بلکہ وہ زنجیر سے اس بری طرح چپک کے رہ گیا تھا کہ جارج کچھ دیر تک اُسے بستر پر لٹا نہیں سکا۔

لیکن جوں ہی اُسے بستر پر لٹا دیا گیا سب کچھ ٹھیک ٹھاک معلوم ہونے لگا۔ اس نے خود کو خوب ڈھانک لیا بلکہ کمبل اپنے کندھوں پر معمول سے زیادہ اوپر تک تان لیے۔ اس نے جارج کی طرف نظر اُٹھائی جو بہت غیر دوستانہ نہیں تھی۔

"آپ کو میرا دوست یاد آچلا ہے، ہے نا؟" جارج نے سر کی جنبش سے اُسے بڑھاوا دیتے ہوئے کہا۔

"میں اچھی طرح ڈھک گیا ہوں؟" اس کے باپ نے یوں پوچھا جیسے وہ دیکھ نہ پا رہا ہو کہ اُس کے پیر کمبلوں میں ٹھیک سے لپٹے ہوئے ہیں یا نہیں۔

"بس ابھی آپ گرم ہو جاتے ہیں!" جارج نے کہا اور اس کو کمبل اچھی طرح

اُڑھا دیے۔

"میں اچھی طرح ڈھک گیا ہوں"؟ اس کے باپ نے ایک بار اور پوچھا۔ اُسے اِس بات کے جواب کی بڑی پریشانی معلوم ہو رہی تھی۔

"پریشان نہ ہوئیے، آپ اچھی طرح ڈھک گئے ہیں۔"

"نہیں!" اس کا باپ اس کی بات کاٹ کر دہاڑا، اس نے کمبل ایسی قوت سے ہٹائے کہ وہ چشم زدن میں اُڑ کر دور جا گرے، اور وہ اچانک پلنگ پر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا صرف ایک ہاتھ سہارے کے لیے چھت کو یوں ہی سا چھو رہا تھا۔

"تم مجھ کو ڈھک دینا چاہتے تھے، میں جانتا ہوں میرے ننھے چھوکرے، مگر ابھی میں ڈھانکے جانے کا نہیں۔ اور یہ میرے بدن کا آخری زور سہی لیکن یہ تمھارے لیے بہت ہے، تمھارے لیے بہت زیادہ ہے۔ بے شک میں تمھارے دوست سے واقف ہوں۔ وہ تو میرا دل پسند بیٹا ہوتا، تم اسی لیے تو اس کے ساتھ اتنے دن ڈھونگ رچاتے رہے ہو، اور نہیں تو کس لیے؟ تم سمجھتے ہو میں اس کے لیے کُڑھتا نہیں رہا ہوں؟ اور اسی لیے تو تم کو اپنے دفتر میں بند ہو کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ صاحب کام کر رہے ہیں اُن کا ہرج نہ ہونے پائے۔ اسی لیۓ نا کہ تم اپنے ننھے مُنّے جھوٹے خط روس بھیج سکو، مگر شکر ہے کہ کسی باپ کو کہیں یہ سیکھنے نہیں جانا پڑتا ہے کہ اپنے بیٹے کو کیوں کر تاڑا جائے۔ اور اب جب تم کو یقین ہو گیا کہ تم نے اُسے پچھاڑ دیا ہے کہ تم اُس کے اوپر لد کر بیٹھ سکتے ہو اور وہ اُس سے مَس بھی نہ سکے گا، تب میرا بھولا بیٹا شادی کرنے کی ٹھانتا ہے۔"

جارج اپنے باپ کے حاضر کیے ہوئے اِس عفریت کو مبہوت دیکھتا رہ گیا۔

اس کا دوست جس سے اُس کا باپ اچانک اتنی اچھی طرح واقف نکل آیا تھا،
اب اس کے تصور میں اس طرح اُبھرا جس طرح پہلے کبھی نہیں اُبھرا تھا۔ وہ
اس کو روس کی پہنائیوں میں کھویا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس کو ایک تاراج کیے
ہوئے خالی گودام کے دروازے پر دکھائی دیا۔ اپنے شوکیسوں کے ملبے، اپنے مال
کے پرانچوں، گرتی ہوئی دیوار گیریوں کے درمیان وہ کھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا
آخر اسے اتنی دور کیوں جانا پڑ گیا!

"ادھر آؤ میرے پاس!" اس کا باپ چلّایا اور جارج ایک دم سے
چونک کر بستر کی طرف لپکا، وہ ہر بات کے لیے تیّار تھا، تاہم وہ بیچ ہی میں رُک گیا۔

"چونکہ اُس نے اپنا اسکرٹ اوپر اُٹھا دیا" اُس کے باپ نے گنگناتی
ہوئی آواز میں بولنا شروع کیا۔ "چونکہ اُس نے اپنا اسکرٹ اُٹھا دیا، ایسے،
اُس فاحشہ نے" اور اُس کی نقل اُتارتے ہوئے اس نے اپنی قمیص اتنی اوپر اٹھالی
کہ اُس کی جانگھ کا وہ زخم دکھائی دینے لگا جو اُسے جنگ میں آیا تھا "چونکہ
اُس نے اپنا اسکرٹ اُٹھا دیا، ایسے اور ایسے، اس لیے تم اس سے عشق بگھارنے
لگے، اور اُس کے ساتھ بے کھٹکے کھُل کھیلنے کے لیے تم نے اپنی ماں کا نام
بدنام کیا ہے، اپنے دوست کو دغا دی ہے اور اپنے باپ کو بستر سے لگا دیا ہے
تاکہ وہ ہل نہ سکے۔ لیکن وہ ہل سکتا ہے، یا نہیں؟"

اور وہ کسی ٹیک کے بغیر کھڑا ہو گیا اور اپنی ٹانگیں جھٹکنے لگا۔ اپنی
ہوش مندی پر اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

جارج جہاں تک ممکن ہو سکا اپنے باپ سے دور ایک گوشے میں سکڑ کر
کھڑا ہو گیا۔ مدتوں پہلے سے وہ تہیہ کیے ہوئے تھا کہ اپنے باپ کی ہر حرکت پر

پوری نظر رکھے گا تاکہ کوئی اچانک حملہ، پیچھے یا اوپر سے کوئی جھپٹا اس کو بدحواس نہ کر دے۔ اس وقت اُس کو اپنا یہ کب کا بھولا ہوا فیصلہ یاد آیا اور وہ پھر اسے بھول گیا، جیسے کوئی سوئی کے ناکے میں ذرا سا دھاگا ڈال کر کھینچ لے۔

"لیکن بہرحال تمھارے دوست کے ساتھ دغا نہیں ہوئی ہے۔" اس کا باپ انگلی نچا نچا کر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے چیخا۔ "میں یہاں اِس جگہ اُس کی نمائندگی کرتا رہا ہوں۔"

"ناٹکیے کہیں کے!" جارج پلٹ کر کہے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر فوراً ہی اُسے اپنی بات کی مضرت کا احساس ہوا، اس کی آنکھیں باہر نکل پڑیں، اس نے دانتوں تلے زبان دبا لی، مگر بعد از وقت، یہاں تک کہ تکلیف کی شدت سے اُس کے گھٹنے جواب دے گئے۔

"ہاں، بالکل بالکل، میں ناٹک تو کرتا ہی رہا ہوں، ناٹک! اچھی بات کہی! اس کے سوا ایک بیچارے بوڑھے رنڈوے کی تسلی کا سامان ہی کیا رہ گیا تھا؟ یہ تو بتاؤ۔ اور جواب دیتے وقت اس کا خیال رکھنا کہ تم بہرحال میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ یہ تو بتاؤ کہ میرا ایسا آدمی جو پچھواڑے کے کمرے میں پڑا رہتا ہو، اپنے بے ایمان نوکروں کے ہاتھوں عاجز ہو اور بڑھاپا اس کی ہڈیوں کے گودے تک اُتر چکا ہو، اس کے لیے اس کے سوا اور رہ کیا گیا تھا؟ اور میرا بیٹا دُنیا بھر میں اینڈتا پھر رہا ہے، جو سودے میں نے اس کے لیے کیے تھے ان کو چکاتا پھر رہا ہے، کامیابی کی خوشی سے پھولا نہیں سماتا ہے اور ایک معزز تاجر کا سا سنجیدہ چہرہ بنائے باپ کے سامنے سے ٹل جاتا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو میں تم سے محبت کر ہی نہیں سکتا تھا، میں جس کی طرف سے

تم نے پیٹھ پھرا لی ؟

اب وہ آگے کی طرف جھکے گا، جارج نے سوچا۔ اگر وہ گر پڑا اور چوٹ کھا گیا تو؟ یہ الفاظ اُس کے دماغ میں پھنپھنکارتے ہوئے گزرے۔

اس کا باپ آگے کی طرف جھکا، لیکن گرا نہیں۔ چوں کہ جیسا کہ اس کا خیال تھا، جارج اس کے نزدیک نہیں آیا، اس لیے وہ پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

" جہاں ہو وہیں رہو۔ مجھے تمھاری ضرورت نہیں! تم سمجھتے ہو کہ تم میں یہاں تک آنے کی طاقت ہے اور تم اپنی خوشی سے مجھ سے الگ کھڑے ہو۔ اس پر نہ بھولنا۔ ہم دونوں میں اب بھی میرا کس بل کہیں زیادہ ہے۔ خود اپنی ذات سے تو شاید میں پست ہو چکا ہوتا لیکن تمھاری ماں نے مجھے اپنی قوت اتنی دے دی ہے کہ میں نے تمھارے دوست سے بخوبی تعلقات بڑھا لیے ہیں، اور تمھارے گاہک یہ میری جیب میں رکھے ہوئے ہیں!"

" اس نے اپنی قمیص میں بھی جیبیں لگوا رکھی ہیں! جارج نے اپنے آپ سے کہا اور سمجھ لیا کہ یہ بات کہہ کر وہ اس کو دُنیا بھر کی نظروں میں ایک کڈھب آدمی بنا دے گا۔ یہ خیال اسے بس دم بھر کے لیے آیا اس لیے کہ وہ سب کچھ بھولتا جا رہا تھا۔

" ذرا اپنی دُلہن کو باہوں میں لے کر میرے راستے میں آ کے تو دیکھو! میں اس کو تمھاری گود سے گھسیٹ لوں گا، تم سمجھ بھی نہیں سکتے کس طرح!"

جارج نے بے اعتباری سے مُنھ بنایا۔ اس کا باپ اپنے الفاظ کی صداقت پر زور دینے کے لیے اُس کی سمت سر کو جُنبش دے کر رہ گیا۔

" کتنا مزہ آیا ہے مجھے جب تم مجھ سے اپنے دوست کو منگنی کی خبر دینے کی اجازت طلب کرنے آئے ہو۔ اسے پہلے ہی سے سب معلوم ہے احمق لونڈے، اسے سب معلوم ہے! میں اس کو خط لکھتا رہا ہوں، کیوں کہ تم لکھنے کا سامان میرے پاس سے ہٹانا بھول گئے تھے اسی لیے تو وہ برسوں سے یہاں آیا نہیں۔ خود تم کو جو کچھ معلوم ہے وہ سب اس کو سَو گنا اچھی طرح معلوم ہے۔ بائیں ہاتھ میں وہ تمھارے خط کو کھولے بغیر مسلتا مروڑتا رہتا ہے اور داہنے ہاتھ میں میرا خط لیے اُسے غور سے پڑھتا ہے:"

جوش میں آکر وہ سر کے اوپر اپنے ہاتھ لہرانے لگا۔

" وہ سب کچھ ہزار گُنا اچھی طرح جانتا ہے"! اس نے چلّا کر کہا۔

" دس ہزار گُنا"! جارج نے اپنے باپ کا مذاق اُڑانے کے لیے کہا، لیکن ابھی یہ الفاظ اُس کے مُنھ ہی میں تھے کہ اُن کے اندر بلا کی سنجیدگی پیدا ہو گئی۔

" میں تو برسوں سے انتظار کر رہا ہوں کہ تم ایسا کوئی سوال لے کر میرے پاس آؤ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے دُنیا میں اس کے سوا کوئی اور بھی کام ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اخبار پڑھا کرتا ہوں؟ یہ دیکھو"! اور اس نے جارج کی طرف ایک اخبار پھینک دیا جو معلوم نہیں کس طرح اُس کے بستر میں آگیا تھا۔ یہ ایک پُرانا اخبار تھا جس کا آج تک جارج نے نام بھی نہیں سُنا تھا۔

" تم نے بڑے ہونے میں کتنا وقت لگا دیا۔ تمھاری ماں اپنی حسرت میں

مر گئی۔ اس کو یہ خوشی کا دن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ روس میں تمہارے دوست کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ تین برس پہلے ہی وہ بیلا پڑ کے پھینک دینے کے قابل ہو گیا تھا، اور رہ گیا میں، تو تم دیکھ ہی رہے ہو کہ کس حال میں ہوں۔ خیر تمہارے بھی تو آنکھیں ہیں۔"

"تو آپ میری تاک میں تھے!" جارج چلایا۔

اس کا باپ افسوس کے لہجے میں بول اٹھا:

"میں سمجھتا ہوں یہ بات تم پہلے ہی کہہ دینا چاہتے تھے۔ لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" پھر ذرا بلند آواز سے بولا: "تو اب تم کو معلوم ہو گیا کہ دنیا میں تمہارے علاوہ اور کیا کیا ہے، ابھی تک تم کو صرف اپنی ہی خبر رہی ہے۔ ایک بھولا بھالا بچہ، ہاں، ایسے ہی تھے تم، سچی بات ہے لیکن اس سے بھی زیادہ سچی بات یہ ہے کہ تم ایک شیطان صفت انسان بن کر رہ گئے ہو! تو پھر سن لو، اب میں تم کو موت کی سزا سناتا ہوں، موت بذریعہ غرقابی!"

جارج کو محسوس ہوا جیسے اسے کمرے سے باہر ڈھکیل دیا گیا ہے، دھماکے کی وہ آواز جس کے ساتھ اس کا باپ اس کے پیچھے پلنگ پر گرا تھا، بھاگتے میں بھی اسکے کانوں میں گونج رہی تھی۔ زینے پر، جیسے وہ کسی سیدھے نشیب کی طرح جھپٹتا ہوا طے کر رہا تھا، اس کی ٹکر اس ملازمہ سے ہو گئی جو اس کا کمرہ صاف کرنے کے لیے اوپر آ رہی تھی۔

"یسوع!" وہ چلائی اور سینہ بند سے اپنا چہرہ چھپانے لگی لیکن وہ جا بھی چکا تھا۔

وہ پھاٹک سے نکلا، پانی کی طرف کھنچتا ہوا، سڑک پر آیا۔ اب وہ جنگلے کو

یوں جکڑے ہوئے تھا جیسے کوئی فاقوں کا مارا ہوا آدمی غذا کو دبوچ لیتا ہے۔ وہ ایک جھکولا لے کر جنگلہ پار گیا۔ نوجوانی کے زمانے میں وہ جمناسٹک کا مانا ہوا ماہر تھا اور اُس کے ماں باپ کو اس پر فخر تھا۔ ابھی اُس کی کمزور پڑتی ہوئی گرفت برقرار تھی کہ اُسے جنگلوں کے درمیان ایک بس آتی دکھائی دی جو اُس کے گرنے کے جھماکے کو آسانی سے چھپا سکتی تھی۔

اُس نے دھیمی آواز میں پکارا۔

"اچھی اماں، اچھے ابا، اس پر بھی میں آپ سے ہمیشہ محبت کرتا رہا۔"

اور اُس نے خود کو گرا دیا۔

اس وقت پُل کے اوپر سے سواریوں کا کبھی ختم نہ ہونے والا سیلاب گزرتا چلا جا رہا تھا + +

عزیز ترین میکس!

میری آخری فرمائش:

میرے چھوڑے ہوے روزنامچے، مسوّدے، خطوط، خاکے وغیرہ، جو میری کتابوں کے بکس میں، کپڑوں کی الماری میں، گھر اور دفتر کے ڈسک میں ملیں، یا کہیں بھی کوئی تحریر پڑی رہ گئی ہو اور تمھیں نظر آجائے، اور وہ تمام تحریریں اور خاکے بھی جو تمھارے پاس ہوں یا دوسروں سے میرے نام پر مل سکیں، سب کو بے پڑھے جلا دیا جائے۔

تمھارا

فرانز کافکا